زیر بحث آیت میں یہ جو فرمایا کہ "صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں" تو اس سے مقصود ایک طرف تو یہ ہے کہ ان دونوں شعائر کو جاہلیت کے گرد و غبار سے پاک کر کے ان کو وراثتِ ابراہیمی کی حامل امت کے لیے از سرِ نو اجاگر کیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عرب جاہلیت نے ان دونوں پہاڑوں پر، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے، دو بت رکھ دیے تھے اور ان بتوں کے لیے سعی و طواف کرنے لگے تھے جس کے سبب سے ان شعائر کا نہ صرف شعائر ابراہیمی میں سے ہونا مشتبہ ہو گیا تھا بلکہ یہ علانیہ شرک و بت پرستی کے مظہر بھی بن گئے تھے۔ قرآن نے اوپر کی آیات میں جس طرح بیت اللہ کو، تمام مشرکانہ آلودگیوں سے پاک صاف کر کے، اس کے اصل ابراہیمی جمال میں پیش کیا اسی طرح یہاں صفا اور مروہ کی اصل تاریخ بیان فرمائی کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے شعائر اللہ میں سے ہیں اور ان کے سعی و طواف کی سنت حضرت ابراہیمؑ کی سعی و طواف کی یادگار ہے لیکن مشرکین نے جس طرح توحید کے مرکز بیت اللہ میں سیکڑوں بت لا کر رکھ دیے اسی طرح ان شعائر کو بھی بت پرستی سے ملوث کیا۔ اب یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ تم گندگی کے اس ڈھیر کو ہٹا کر ان شعائر کو از سرِ نو اجاگر کرو اور ان کے سعی و طواف کو صرف اللہ ہی کے لیے خاص کرو۔

دوسری طرف یہود نے ان شعائر پر تحریف اور کتمان کا جو پردہ ڈال دیا تھا، جیسا کہ آگے والی آیت میں ذکر آرہا ہے، قرآن نے وہ پردہ بھی اٹھا دیا۔ اوپر ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ تورات میں یہ ذکر صراحت کے ساتھ موجود تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی مروہ کے پاس کی لیکن یہود نے محض اس خیال سے اس لفظ کا صحیح تلفظ بالکل مسخ کر ڈالا کہ کسی طرح اس مقام کو مکہ کے بجائے بیت المقدس میں ثابت کر دیں۔ اور اس طرح آخری نبی کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں تورات میں موجود ہیں وہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل کی جگہ حضرت اسحاقؑ کی نسل کی طرف منتقل ہو سکیں۔ قرآن نے یہاں مروہ کا حوالہ دے کر اس نشان کی طرف انگلی اٹھا دی جس کو محض حسد اور شرارت کی بنا پر غائب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

ان دونوں پہاڑیوں کے طواف کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی صحیح شکل اور اس کے حدود کا تعین دوسرے مناسکِ حج کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں لفظ طواف کا استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد وہ سعی ہی ہے جو ان دونوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ اس سعی کو طواف کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شکل اس طواف سے ملتی جلتی ہوتی ہے جو خانہ کعبہ کے ارد گرد ہوتا ہے۔ اس سعی کو حج و عمرہ کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ حج و عمرہ کے مجموعہ ہی کا ایک جزو ہے، ان سے علیحدہ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ اس سے ان مشرکانہ رسوم کی بالکل نفی ہو جاتی ہے جن کا اضافہ ان شعائر کے سلسلہ میں مشرکین نے کر دیا تھا۔

اس طواف کا حکم جن الفاظ میں وارد ہے وہ کسی قدر وضاحت طلب ہیں۔ فرمایا ہے۔

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا   پس جو حج یا عمرہ کرے تو اس کے لیے اس بات میں

جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف کرے۔

حکم سعی کی نوعیت

اس اسلوب بیان سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ اس سعی کے لیے شریعت میں صرف اجازت ہے، اگر کوئی شخص یہ نہ کرے یا نہ کر سکے تو اس میں بھی کوئی خاص قباحت نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مراد یہ ہوتی تو اسلوب کلام، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا کے بجائے اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ فرمانے کے بعد کہ صفا اور مروہ دونوں شعائر اللہ میں سے ہیں یہ کہنا کچھ ناموزوں اور بے جوڑ سا ہو جاتا ہے کہ ان کا طواف کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے۔ پہلی بات کے بعد اس کے ہم وزن اور اس سے ہم آہنگ بات تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کا طواف ضروری قرار دیا جائے۔ رہا یہ سوال کہ یہ کس درجہ میں ضروری ہے، اس کی حیثیت فرض کی ہے یا واجب کی یا مستحب کی؟ اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال کرنے کی تو کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کہ اس قدر شاندار تمہید کے بعد اصل بات اتنے کمزور درجہ کی ہو۔ اسی وجہ سے ہمارا خیال یہی ہے کہ یہاں سعی کا حکم ہے اور یہ حکم وجوب کے درجہ میں ہے۔

لیکن اس پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدعا یہی ہے تو یہاں فَلَا جُنَاحَ کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس رفع حرج کا تعلق سعی کے حکم سے نہیں ہے بلکہ اس قباحت سے ہے جو اس حکم کے نزول کے وقت مقام سعی میں بتوں کی موجودگی کی وجہ سے پائی جاتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت صفا اور مروہ میں یہ قباحت موجود ہے لیکن چونکہ یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے شعائر حج میں سے ہیں اس وجہ سے حج و عمرہ کے موقع پر ان کے درمیان سعی کرو، تمہارا عمل تمہاری نیت کے مطابق ہوگا۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ میں تطوع سے مراد یہ ہے کہ آدمی کسی فرض سے سبکدوش ہو چکنے کے بعد خدا کی خوشنودی اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مزید اس کو ایک نفلی نیکی کی حیثیت سے انجام دے۔ یہاں اس تطوع کا تعلق صرف سعی کے حکم سے نہیں ہے۔ اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سعی کوئی مستقل عبادت نہیں ہے بلکہ یہ حج و عمرہ ہی کا ایک ضمیمہ ہے، اس وجہ سے اس تطوع کا تعلق بھی حج و عمرہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو حج و عمرہ وہ ہے جو ادائے فرض کے طور پر انجام دیا جائے، دوسرے تطوع کے طور پر بھی حج و عمرہ کیے جا سکتے ہیں، جو لوگ ایسا کریں گے اللہ ان کی اس نیکی کو قبول فرمائے گا اور یہ اس کے علم میں رہے گی۔ ایک دن وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

شکر کا لفظ صلوٰۃ یا توبہ کے الفاظ کی طرح ان الفاظ میں سے ہے جن کے معنی میں نسبت کی تبدیلی سے فرق ہو جایا کرتا ہے، جب بندے کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے تو اس کے معنی شکر گزاری کے ہوتے ہیں، لیکن جب اس کی نسبت خدا کی طرف ہو تو اس کے معنی قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (۱۵۹)

یہود کا کتمانِ حق

یہ اشارہ یہود کی طرف ہے اور آیت میں بیّنات اور ہدیٰ سے مراد اگرچہ وہ عام تعلیمات بھی ہیں جن کو یہود نے چھپانے کی کوشش کی لیکن یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ اس سے خاص طور پر وہ نشانیاں مراد ہیں جو تورات میں اللہ تعالیٰ نے اس لیے واضح فرمائی تھیں کہ ان کی مدد سے یہود کو آخری پیغمبر کے باب میں رہنمائی حاصل ہو سکے۔ لیکن یہود نے ان نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کو چھپانے کی کوشش کی۔ اس کی بعض مثالیں ہم اس کتاب کے پچھلے صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ہم استاذ امام کی عظیم تصنیف الرای الصحیح فی من ہو الذبیح کی آٹھویں فصل کا حوالہ دیں گے جس میں انھوں نے مروہ سے متعلق یہود کی تحریفات پر بحث کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی جگہ کو تورات سے غائب کرنے کے لیے کیا کیا تدبیریں کیں اور کس بیدردی کے ساتھ لفظ مروہ کا حلیہ بگاڑا تاکہ آخری نبی کی پیشین گوئیوں سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں گھپلا پیدا کیا جا سکے۔

ایک عظیم حقیقت کا چھپانا جب کہ وہ ان کی اپنی کتاب میں اچھی طرح واضح کی جا چکی ہو اور جس کو خلق کے سامنے واضح کرنے کا ان سے عہد بھی لیا جا چکا ہو، جیسا کہ آل عمران ۱۸۷ میں حوالہ ہے۔ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ (اور یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے میثاق لیا کہ اس کتاب کو اچھی طرح لوگوں کے سامنے واضح کرنا) یہود کا ایک ایسا جرم تھا جس پر وہ خدا کی لعنت کے مستحق ٹھہرے اور کتاب الٰہی کی امانت جو ان کے سپرد کی گئی تھی ان سے چھین کر دوسروں کے سپرد کر دی گئی۔

اس لعنت کے متعلق فرمایا ہے کہ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ اس کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح اصطفاء یعنی کسی امت کا دنیا کی امامت کے لیے منتخب کیا جانا اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے اسی طرح یہ لعنت اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑی سزا ہے جس قوم کو یہ سزا دی جاتی ہے وہ دنیا میں توفیق ہدایت اور منصبِ امامت سے محروم کر کے ذلت و خواری میں مبتلا کر دی جاتی ہے اور آخرت میں اس کے لیے ابدی عذاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی حق پوشی سے صرف اپنی ہی ضلالت کا سامان نہیں کرتی بلکہ راہ کے نشانات ہدایت غائب کر کے دوسرے بے شمار لوگوں کو بھی گمراہی اور ہلاکت میں مبتلا کرتی ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۱۶۰)

توبہ کے لیے شرط

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس لعنت سے محفوظ رہیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حق پوشی کے جرم سے توبہ کر لیں۔ اس توبہ کے ساتھ "أَصْلَحُوا" کی شرط لگائی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ توبہ اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک آدمی اس غلطی کی اصلاح نہ کرے جس کا مرتکب ہو رہا ہے۔ مزید شرط اس کے ساتھ

"بَیَّنُوْا" کی لگائی۔ یہ موقع کی مناسبت سے ہے اور سابق الذکر "اَصْلَحُوْا" کی وضاحت کر رہی ہے۔ یعنی آخری نبی سے متعلق تورات کے جن حقائق و بینات کو انھوں نے چھپایا ہے اس کو ظاہر کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کم از کم یہود کے خواص اور علما ان تحریفات سے بے خبر نہیں تھے جو حق پوشی کی سازش کے تحت کی گئی تھیں یا کی جا رہی تھیں۔ اس کا ثبوت اس امر سے بھی بہم پہنچ رہا ہے کہ یہود کے اہل علم میں سے جو لوگ نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہوئے انھوں نے اس قسم کے بہت سے حقائق سے پردے اٹھائے بھی۔

اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ میں توبہ کے ساتھ علیٰ کا صلہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس کے اندر رحمت کا مضمون بھی پوشیدہ ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کی توبہ میں قبول کرتا اور ان پر رحم کرتا ہوں۔ لفظ کی اس مخفی حقیقت کو اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ کہہ کر واضح فرما دیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (۱۶۱)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور حالت کفر ہی میں مرے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی ضد پر اڑے رہ گئے اور توبہ و اصلاح اور اظہار و اعلان حق سے محروم ہی دنیا سے اٹھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق پوشی ایک ایسا جرم ہے جو ان کی دینداری کی دوسری باتوں اور ان کے ایمان و محبتِ الٰہی کے تمام دعووں کو بالکل باطل کر دے گا۔ اور اس کی پاداش میں وہ اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کے سزاوار ہوں گے۔ یہاں اللہ کی لعنت کے ساتھ فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کا ذکر اس اجمال کو واضح کر رہا ہے جو اوپر والی آیت کے الفاظ یَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ میں موجود تھا اور الناس کے ساتھ اجمعین کی قید یہ حقیقت واضح کر رہی ہے کہ قیامت کے روز جب اصل حقیقت سے پردہ اٹھے گا تو صرف نیک لوگ ہی ان پر لعنت نہیں بھیجیں گے بلکہ وہ گنہگار بھی ان پر لعنت بھیجیں گے جو ان کی پیروی میں گمراہ ہوں گے۔

خٰلِدِیْنَ فِیْھَا لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ (۱۶۲)

یعنی نہ تو جس عذاب میں وہ ڈالیں جائیں گے اس میں کوئی تخفیف ہو گی اور نہ اس کے تسلسل میں کوئی وقفہ یا انقطاع واقع ہو گا کہ اس سے انہیں ذرا دم لینے ہی کا موقع مل جائے۔

۵۱۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۶۳-۱۶۷

سورہ کے مطالب کا دوسرا باب

آیات ۱۶۲ پر اس سورہ کا پہلا باب ختم ہوا۔ اس باب میں یہود منصبِ امامت سے معزول ہوئے اور ایک نئی امت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ نمایاں ہوئی۔ اب آگے آیت ۱۶۳ سے اس سورہ کے مطالب کا دوسرا باب شروع ہو رہا ہے جس میں اس نئی امت کے لیے از سر نو شریعت الٰہی کی تجدید کی جا رہی ہے۔ اس باب میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ امت کو وہ احکام دیے گئے ہیں جن کے لیے سورہ

کے زمانہ نزول کے حالات متقاضی تھے اور ساتھ ہی ہر حکم کے تحت ان بدعات کی تردید کی گئی ہے جو یہود یا مشرکین نے شریعت الٰہی میں ملا دی تھیں۔

اس باب کا آغاز توحید کے بیان سے ہو رہا ہے اس لیے کہ تمام دین کی بنیاد اسی چیز پر ہے۔ توحید کے دعوے کے ذکر کے بعد اس کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ توحید کی یہ دلیل وہی دلیل ہے جس کی طرف اس کتاب کی فصل ۲۲ میں ہم دلیل توافق کے نام سے اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں یہ دلیل اپنے بعض نئے پہلوؤں کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے جن کی وضاحت آیات کی تفسیر کے تحت آئے گی۔ پھر شرک کی تردید فرمائی ہے اس ضمن میں کسی چیز کو خدا کے حکم کے بغیر حرام یا حلال ٹھہرانے کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ اس لیے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ چیز بھی شرک ہی میں داخل ہے۔

پھر ان چیزوں کی طرف ایک سرسری اشارہ فرمایا جو فی الواقع اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مشرکین یا اہل کتاب نے بعض چیزیں جو اپنے جی سے محض اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت یا اپنی خواہشوں کے لیے حرام یا حلال کی ہیں ان کی تحریم و تحلیل کو شریعت الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد چند آیات میں مشرکین کو ان کی اندھی بہری تقلید آبا پر اور اہل کتاب کو ان کی حق پوشی پر سرزنش فرمائی ہے کہ اگر یہ عقل سے کام لیتے اور محض خواہشات نفس کی پیروی میں ضلالت کو ہدایت پر ترجیح نہ دیتے تو وہ توحید کی مخالفت اور شرک کی حمایت نہ کرتے لیکن انھوں نے اپنی شامت اعمال سے اپنے لیے ابدی ہلاکت کی یہی راہ اختیار کی ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۶۳-۱۷۶ ع ۱۹

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿۱۶۳﴾ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ
الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾
اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ
وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ
اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ
اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ
النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ
وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا
يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ
مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ
شَـيْـــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ
يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ
لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ
وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ
الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ
فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ

يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع

ترجمہ آیات ۱۶۳-۱۷۶

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان اور رحیم ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جان دار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۱۶۳-۱۶۴

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں، جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیئے۔ لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب کہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب

دینے والا ہے۔ ۱۶۵

اس وقت کا خیال کرو جب کہ مقتدا اپنے پیروؤں سے اظہار براءت کریں گے، اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تعلقات یک قلم ٹوٹ جائیں گے اور ان کے پیرو بھی کہیں گے کہ اے کاش ہمیں دنیا میں ایک بار اور جانا نصیب ہوتا کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہار براءت کر سکتے جس طرح انھوں نے ہم سے اظہار براءت کیا ہے! اس طرح اللہ ان کے اعمال ان کو سرمایہ حسرت بنا کر دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷

اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں ان کو کھاؤ۔ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تو بس تمھیں برائی اور بے حیائی کی راہ سوجھائے گا اور اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمھیں کوئی علم نہیں ہے۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹

اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہ ہدایت پر رہے ہوں؟ ان کافروں کی تمثیل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے جو پکارا اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی سمجھتی ہوں، یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، یہ سمجھ نہیں سکتے۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱

اے ایمان والو، جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اللہ ہی کے شکر گزار بنو اگر تم اس کی بندگی کرنے والے ہو۔ اس نے تو بس تمھارے لیے مردار، خون، سور کا گوشت

اور غیر اللہ کے نام کے ذبیحہ کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس کے لیے کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ۱۷۲-۱۷۳

بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو خدا نے اپنی کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں۔ ان لوگوں سے خدا قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا، نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے لیس عذاب دردناک ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت پر اور عذاب کو مغفرت پر ترجیح دی، یہ دوزخ کے معاملہ میں کتنے ڈھیٹ ہیں! ۱۷۴-۱۷۵

یہ اس لیے ہوگا کہ اللہ نے اپنی کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے اور جن لوگوں نے اس کتاب کے معاملہ میں اختلاف کیا ہے وہ مخالفت میں بہت دور نکل گئے۔ ۱۷۶

۵۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۱۶۳)

اِلٰہ کے معنی معبود کے ہیں۔ اسی پر الف لام تعریف کا داخل کر کے لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کے لیے بطور اسم ذات استعمال ہوا۔ رحمان اور رحیم کی تحقیق اور ان دونوں کے فرق کی وضاحت سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

یہ توحید ہی سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز ہے جو ملتِ ابراہیمؑ کی وراثت کی حیثیت سے اس امتِ مسلمہ کی طرف منتقل ہوئی۔ اس کا ذکر یہاں مثبت اور منفی دونوں ہی پہلوؤں سے فرمایا ہے تاکہ اس میں کسی رخنہ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس میں اگر کوئی رخنہ پیدا ہو جائے تو یہ بنیاد کا رخنہ ہے جس سے شیطان کو پورے دین میں رخنہ اندازی کے لیے راہ مل جاتی ہے۔

رحمان اور رحیم کے ذکر کے دو پہلو

اس توحید کے ذکر کے ساتھ اسمائے حسنیٰ میں سے رحمان اور رحیم کا حوالہ دو مختلف پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔

اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ شرک کے اسباب و محرکات میں سے ایک بہت بڑا سبب خدا کے ہر قسم کے شغل و عمل اور ہر نوع کے تعلق سے ارفع اور بالاتر ہونے کا غلط تصور بھی ہے۔ یہ تصور ہے تو ایک تنزیہی تصور لیکن بعض صورتوں میں یہ خدا کی بے ہمگی کو اس قدر بڑھا دیتا ہے کہ خلق سے اس کا تعلق بالکل ہی منقطع ہو جاتا ہے اور اس تک رسائی حاصل کرنا یا خلق کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق رکھنا اس کی شانِ الوہیت کے منافی قرار پا جاتا ہے۔ خدا کی بے ہمگی کا یہ تصور فطری طور پر دلوں میں اس کی طرف سے ایک مایوسی پیدا کرتا ہے اور یہ مایوسی بالآخر ان وسائل و وسایط کو جنم دیتی ہے جن کو انسان خدا کے نہ پا سکنے کی شکل میں اپنے لیے تسلی و طمانیت کا ذریعہ بناتا ہے۔ قرآن نے معرفتِ الٰہی کی راہ کے اس مغالطے کو دور کرنے کے لیے جگہ جگہ یہ کیا ہے کہ خدا کی وحدانیت، اس کی بے ہمگی اور اس کی برتری کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کی ایسی صفات کا بھی حوالہ دے دیا ہے جو خلق کے ساتھ اس کے تعلق کو واضح کرنے والی ہیں تاکہ انسان وسائل و وسائط کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے خود خدا کے دامنِ رحمت کو پکڑنے اور اسی میں چھپنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس پہلو سے سورۂ اخلاص میں، جو توحید کی سب سے بڑی سورہ ہے، اگر ایک طرف خدا کی بے ہمگی کو واضح کرنے کے لیے هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (وہ اللہ بے ہمہ ہے) فرمایا تو ساتھ ہی اس کی باہمگی کو واضح کرنے کے لیے اَللّٰهُ الصَّمَدُ (اللہ باہمہ ہے) بھی فرمایا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ خدا سب سے بے نیاز اور بالاتر ہونے کے باوجود سب کے لیے پناہ، سب کے لیے مرجع اور سب کے لیے سہارے کی چٹان بھی ہے۔

اسی اصول پر زیرِ بحث آیت میں بھی خدا کی وحدانیت کو مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے بیان کرنے کے بعد یہ بھی واضح فرما دیا کہ وہ خدا رحمان اور رحیم ہے۔ ہم سورۂ فاتحہ میں ان دونوں لفظوں کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ان میں سے پہلا لفظ خدا کی رحمت کے جوش پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا اس کی رحمت کے تسلسل اور دوام پر۔ مقصد یہ ہے کہ خدا ہے تو واحد اور یکتا، سب سے بے نیاز، اور سب سے بالاتر لیکن وہ رحمان اور رحیم بھی ہے۔ اس نے اپنے جوشِ رحمت سے تمھیں وجود بخشا ہے، اپنی رحمت ہی کے آغوش میں تمھاری تربیت اور پرورش کر رہا ہے اور اپنی اس رحمت ہی کے لیے اس نے تمھارے واسطے جزا اور سزا کا ایک دن مقرر کیا ہے پس تم اسی کے لیے جیو اور اسی کے لیے مرو اور اپنی تمام آرزوئیں اور امیدیں اکیلے اسی سے وابستہ کرو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ مشرک اور بت پرست قوموں نے ہمیشہ قہر و غضب کو الوہیت کے ضروری لوازم میں سے سمجھا ہے۔ انھوں نے کائنات کے بادشاہ کو دنیاوی بادشاہوں پر قیاس کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ جب دنیا کے بادشاہ صرف ایک ایک علاقے کے بادشاہ ہو کر یہ جلال و جبروت رکھتے ہیں کہ ان کے مقربین اور درباریوں کے سوا کسی کے لیے بھی ان کے سامنے مجالِ دم زدن نہیں ہوتی، وہ جس کو چاہیں اور جب چاہیں دار پر چڑھا دیتے ہیں تو جو سارے جہان کا بادشاہ ہے اس کے جلال و جبروت اور اس کے قہر و غضب کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس طرح انھوں نے خدا کا تصور ایک نہایت خوفناک اور ہولناک ہستی کی حیثیت سے کیا اور پھر اس کے

کچھ مقربین اور درباری محض اپنے ذہن سے ایجاد کر کے ان کی پرستش شروع کی تاکہ یہ ان کو اس ہولناک خدا کی آفتوں سے محفوظ رکھیں۔ آسمانی مذاہب رکھنے والی قومیں اگرچہ خدا کے صحیح تصور سے ناآشنا نہیں تھیں لیکن امتدادِ زمانہ نے مشرک قوموں کے اثرات سے ان کے عقائد کو بھی آلودہ کر دیا اور ان کے یہاں بھی خدا کی جمالی صفات پر اس کی جلالی صفات کا رنگ غالب ہو گیا۔ چنانچہ تورات کے مطالعہ سے یہ حقیقت صاف عیاں ہوتی ہے کہ یہود نے بھی خدا کے قہر و جلال کی داستان اتنی بڑھا دی تھی کہ اس کے مقابل میں خدا کے رحمان و رحیم ہونے کا تصور بالکل دب گیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ بھی مشرک قوموں کی طرح خدا کی رحمت حاصل کرنے کے لیے مقربین اور سفارشیوں کے محتاج ہوئے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے ان بزرگوں کو وسیلہ ٹھہرایا جن کے تقدس و تقرب کی روایتیں ان کے ہاں موجود تھیں اور پھر آہستہ آہستہ خاندانِ اسرائیل کو تو انھوں نے خدا کے چہیتوں اور محبوبوں میں شامل کر لیا اور غیر بنی اسرائیل خدا کے قہر و غضب کے لیے رہ گئے ——— چونکہ آیت زیر بحث میں توحید کی یہ امانت بنی اسرائیل سے واپس لے کر امتِ مسلمہ کے حوالے کی جا رہی ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ خدا کی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت پر سے وہ پردہ اٹھا دیا جائے جو مشرکین کی تقلید میں یہود نے ان پر ڈال دیا تھا تاکہ یہ امت صفاتِ الٰہی کے باب میں اس نقطۂ اعتدال پر آجائے جو امتِ وسط ہونے کے پہلو سے اس کے مزاج کی خصوصیت ہے اور اس طرح شرک کے فتنوں کا سدِ باب ہو جائے۔

ہم یہاں صرف انھی دو پہلوؤں کے ذکر پر قناعت کرتے ہیں۔ اس کے کچھ اور پہلو بھی توجہ کے قابل ہیں لیکن ان کے ذکر کے لیے ہماری اس کتاب میں زیادہ موزوں مواقع آگے آئیں گے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ وَالۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَبَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (۱۶۴)

آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف ایک جامع اشارہ

آسمان اور زمین کی خلقت سے مراد ان کی وہ پیدائش بھی ہے جس سے خالق کی عظیم قدرت واضح ہوتی ہے، ان کی وہ ساخت بھی ہے جس سے اس کی بے مثال کاریگری اور حیرت میں ڈال دینے والی حکمت کی شہادت ملتی ہے، ان کی وہ نفع رسانی اور فیض بخشی بھی ہے جس سے خالق کی رحمانیت و رحیمیت اور پروردگاری ثابت ہوتی ہے، وہ مقصدیت بھی ہے جو گواہی دیتی ہے کہ اتنی حکمتوں سے یہ معمور کارخانہ عبث اور بے غایت نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد ہے جس کے ظہور کے لیے ایک دن مقرر ہے، اور ان کی وہ موافقت اور سازگاری بھی ہے جو ثابت کرتی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں ایک ہی خالق کے ارادہ سے ظہور میں آئے ہیں اور اسی کی اسکیم اور اسی کے حکم کے تحت چل رہے ہیں، ان کے اندر کسی اور کے ارادہ اور تصرف

کو کوئی دخل نہیں ہے ـــــ یہ مختلف پہلو قرآن مجید میں گوناگون اسلوبوں سے واضح کیے گئے ہیں جن کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

اختلاف لیل و نہار سے مراد ایک ترات اور دن کی یکے بعد دیگرے، پورے نظام، پوری پابندی اوقات اور کامل تسلسل کے ساتھ آمد و شد ہے، جیسا کہ فرمایا ہے۔ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَۃً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا ۶۲۔ الفرقان (اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا، ان لوگوں کے لیے جو یاد دہانی حاصل کرنا چاہیں یا خدا کے شکر گزار بننا چاہیں) دوسرے ان کا وہ اختلاف بھی ہے جو ان کے مزاج، ان کی فطرت، ان کی شکل و صورت اور ان کے ظاہری اور باطنی اثرات و نتائج میں ہے لیکن اس اختلاف و تضاد کے باوصف یہ دونوں اس کائنات کی مجموعی خدمت و بہبود میں شب و روز سرگرم ہیں۔

فُلک کے معنی کشتی کے ہیں۔ یہ لفظ اسی شکل میں واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔ مؤنث تو اس آیت ہی میں استعمال ہوا ہے۔ مذکر کے لیے قرآن مجید میں "فی الفلك المشحون" کی ترکیب موجود ہے۔

بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ سے مراد وہ سامان تجارت و معیشت ہے جس کے حمل و نقل کا یہ کشتیاں ذریعہ بنتی ہیں اور جس سے معاشرت و تمدن کی توسیع و ترقی کی نہایت وسیع راہیں کھلی ہیں۔

زمین کی موت اور اس کی زندگی سے مراد اس کا خشک اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سر نو سبزوں اور پودوں سے لہلہا اٹھنا ہے۔

لفظ 'دابۃ' کا استعمال

'دابۃ' کا معروف استعمال تو زمین پر چلنے پھرنے والوں جانوروں ہی کے لیے ہے بلکہ زیادہ نمایاں طور پر ان جانوروں کے لیے جو سواری یا بار برداری کے کام آتے ہیں، لیکن یہ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس معنی میں ہم 'جاندار' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے پہلے معنی کے لحاظ سے پرندے اس کے مفہوم سے خارج ہیں، صرف زمین پر چلنے پھرنے یا رینگنے والے جانور ہی اس سے مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے بعض مقامات پر پرندوں کو اس لفظ کے مفہوم سے الگ رکھا ہے، مثلاً فرمایا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ ۳۸۔ انعام (اور نہیں ہے زمین پر چلنے والا کوئی جانور اور نہ اپنے بازوؤں سے اڑنے والا کوئی پرندہ) لیکن جب یہ اپنے دوسرے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے تحت سارے ہی جاندار آجاتے ہیں، عام اس سے کہ وہ چرند ہیں یا پرند بلکہ اس صورت میں یہ بنی نوع انسان کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اس مفہوم کے لیے قرآن مجید سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ فرمایا ہے۔

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ ۴۵۔ فاطر	اور اگر اللہ لوگوں کو ان کی بدعملیوں پر فوراً سزا دینے والا ہوتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی جیتا نہ چھوڑتا۔

اس آیت میں "دابۃ" کا لفظ تمام جانداروں کے لیے استعمال ہُوا ہے، عام اس سے کہ وہ چرند و پرند ہوں یا انسان۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ (۶۰- عنکبوت)	اور کتنے جاندار ہیں جو اپنے ساتھ اپنی روزی اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو بھی روزی دیتا ہے اور تم کو بھی۔

اس آیت میں "دابہ" کا لفظ چرند و پرند سب پر حاوی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۶- هود)	اور زمین میں کوئی جاندار نہیں ہے مگر اللہ ہی کے ذمہ ہے اس کی روزی۔

اس آیت میں بھی یہ لفظ اپنے وسیع معنی ہی میں استعمال ہُوا ہے۔

ہمارے نزدیک آیت زیر بحث میں بھی یہ لفظ جاندار کے معنی میں استعمال ہُوا ہے۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ اسی مفہوم کے لحاظ سے کیا ہے۔

'تصریفِ ریاح' سے مراد

"تَصْرِیْفِ رِیَاح" سے مراد ہواؤں کی گردش ہے۔ ان کی اس گردش کے مختلف پہلو خود قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ کبھی یہ اپنے کندھوں پر پانی سے بوجھل بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں اور زمین کو جل تھل کر دیتی ہیں، کبھی یہ انھی بادلوں کو اس طرح اڑا کرلے جاتی ہیں کہ کہیں ان کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ایک قوم کے لیے یہ عذاب بن کر نمودار ہوتی ہیں، دوسری قوم کے لیے رحمت بن کر۔ انھی کی گردش سے فرعون اور اس کی قوم غرقِ دریا ہوئی اور انھی کے تصرف نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اسی دریا سے پار کرایا۔ پھر کبھی یہ مرطوب بن کر فصلوں کو نشو و نما دیتی، ان کو اگاتی اور پروان چڑھاتی ہیں، کبھی گرم اور خشک ہو کر ان کو پکاتی اور تیار کرتی ہیں، کبھی یہ خزاں بن کر پتّوں کو مرجھاتی اور چمن کو اجاڑتی ہیں، کبھی بہار بن کر ایک ایک ٹہنی اور ایک ایک شاخ کو پھولوں اور کلیوں سے لاد دیتی ہیں۔ ان کے بھیس مختلف ہیں اور ہر بھیس میں نئی آن اور نئی شان ہے اور جو شان بھی ہے وہ ان کے مُصرّف (خدا) کی حکمت و قدرت اور اس کی رحمت و ربوبیّت کا ایک عظیم نشان ہے۔

تسخیر کا مفہوم

تسخیر کے معنی ہیں کسی کو مطیع و فرمانبردار بنا کر بلا کسی اجرت و معاوضہ کے کسی کی خدمت میں لگا دینا۔ بادلوں کے آسمان و زمین کے درمیان مسخر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ خدا کے امر و حکم کے تحت بالکل مقہور و مجبور ہر لمحہ و ہر آن، بالکل تیار کھڑے ہیں کہ جب، اور جس جگہ کے لیے اور جس شکل میں ان کو حکم ہو وہ اس حکم کی تعمیل کریں۔ یہ مسخر خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی اپنی ربوبیت اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت ان کو رحمت یا عذاب کی جس شکل میں چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ قرآن میں انسانوں کی نسبت کے ساتھ جب ابر و ہوا کی تسخیر کا ذکر آتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ ابر یا ہوا یا سورج یا چاند انسان کے ہاتھ میں مسخّر ہیں یا وہ ان کو مسخّر کر سکتا ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ پروردگارِ عالم نے ان چیزوں کو مسخر کر

کے ان کو انسان کی نفع رسانی اور اس کی خدمت میں لگا دیا ہے اور یہ رات دن خدمت میں لگے رہنے کے باوجود انسان سے کسی اُجرت یا صلہ کے طالب نہیں بنتے۔ اسی وجہ سے جہاں کہیں یہ مضمون بیان ہوا ہے وہاں سَخَّرَ لَكُمْ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے ان کو تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا ہے، یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے۔ تابع فرمان یہ صرف خدا ہی کے ہیں۔ انسان زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خدا نے ان چیزوں کو جن طبیعی قوانین کے ماتحت رکھا ہے ان میں سے بعض کو اپنی سائنس کے زور سے دریافت کرے اور ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ لیکن ان تمام قوانین کا اصل سر رشتہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان اس سر رشتہ پر کبھی قابو نہیں پا سکتا۔

عقل کی تربیت

مذکورہ بالا تمام چیزوں کا حوالہ دے کر فرمایا کہ ان کے اندر عقل سے کام لینے والوں کے لیے آیات ہیں۔ آیت کے معنی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، نشانی اور علامت کے بھی آتے ہیں۔ جو چیز کسی چیز کی نشانی اور علامت ہوتی ہے، وہ اس کی دلیل ہوا کرتی ہے اس وجہ سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مذکورہ چیزیں کس چیز پر اور کس نوعیت سے دلیل ہیں؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ تو فرمایا کہ ان چیزوں کے اندر دلیلیں ہیں لیکن یہ نہیں واضح فرمایا کہ یہ دلیلیں کن چیزوں پر ہیں اور ان کے دلیل ہونے کی شکل کیا ہے۔ نشانیوں کی طرف اشارہ کر کے، اصل سوال کو ہماری عقل و بصیرت پر چھوڑ دیا ہے کہ جو لوگ اپنی عقل اور سمجھ سے کام لیں گے وہ ان دلیلوں کو خود سمجھ جائیں گے۔ قرآن مجید نے یہ طریقہ اکثر مقامات میں اختیار کیا ہے اور مقصود اس سے ہماری عقل و فکر کی تربیت ہے کہ ہم آفاق و انفس کے اندر پھیلے ہوئے دلائل کو خود سمجھنے اور ان سے صحیح نتائج تک پہنچنے کے قابل ہو سکیں۔

قرآن کے اجمالی اشارات پر غور کرنے کا طریقہ

اس طرح کے مواقع میں قرآن پر غور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اجمالی اشارات کو خود قرآن کی روشنی میں تفصیل کا رنگ دینے کی کوشش کی جائے تاکہ واضح ہو سکے کہ پیش کردہ چیزوں سے اس دعوے پر کس طرح دلیل قائم ہوتی ہے۔

مثلاً دیکھیے آسمان و زمین کی خلقت سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، کہیں تو خدا کی قدرت و حکمت پر استدلال کیا ہے، کہیں اس کی پروردگاری اور رحمانیت و رحیمیت پر۔ کہیں ان کے با مقصد و با غایت ہونے پر استدلال کیا ہے اور کہیں ان کے توافق کے پہلو سے ان کے خالق و مالک کی توحید پر۔

اسی طرح رات اور دن کے اختلاف کو کہیں تو حق و باطل کی کشمکش اور غلبۂ حق کی شہادت کے طور پر پیش کیا ہے، کہیں تمثیلی رنگ میں اس سے حیات بعد الموت پر استشہاد کیا ہے اور کہیں ان کے تضاد کے باوجود ان کے اندر ایک اعلیٰ اور برتر مقصد کے لیے جو سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے، اس کو اس حقیقت کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ نور اور ظلمت، روشنی اور تاریکی سب کا خالق ایک ہی ہے، وہی ان اضداد کو اپنی قدرت سے وجود میں لایا ہے اور وہی اپنی حکمت سے ان اضداد کے اندر سازگاری پیدا

کرتا اور اس کائنات کی مجموعی خدمت کے لیے ان کو استعمال کرتا ہے۔

کشتی اور سمندر کا ذکر بھی قرآن میں مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے۔ بعض جگہ تو اس سے انسانی زندگی کا جزو و مد نمایاں کیا گیا ہے کہ انسان ذرا میں مغرور اور ذرا میں مایوس ہونے والی مخلوق ہے، زندگی کی کشتی ہمواری کے ساتھ رواں دواں رہے تو اس چیز کو وہ اپنی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھتا ہے اور اگر یہ کشتی حوادث کے تلاطم میں گھر جائے تو خدا خدا پکارنے لگتا ہے۔ پھر یہیں سے توحید کی اَنفُسی دلیل پیش کی ہے کہ اصل معبود جس کی شہادت دل کی گہرائیوں میں موجود ہے وہ تو اللّٰہ واحد ہی ہے، جس کا سہارا انسان اس وقت ڈھونڈھتا ہے جب دوسرے تمام سہاروں پر سے اس کا اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ بعض جگہ سمندر اور کشتی دونوں کے اختلاف و تضادِ مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ کس طرح ایک بالاتر ہستی کا قانون قدرت و حکمت سمندر اور کشتی میں سازگاری پیدا کر دیتا ہے کہ انسان موجوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک فتح و تسخیر کے دام بچھاتا اور تہذیب و تمدن کے عَلَم گاڑتا پھرتا ہے۔

آسمان سے بارش کا ذکر بھی گوناگوں پہلوؤں سے ہوا ہے۔ ربوبیت اور رحمت کی شہادت تو یہ ہے ہی۔ حیات بعد الموت پر بھی اس کی شہادت نہایت واضح ہے اور اس کی طرف یہاں بھی اشارہ ہے۔ توحید پر بھی اس سے استدلال کیا ہے کہ جب آسمان سے اترنے والی بارش زمین کو زندگی اور روئیدگی بخشتی ہے تو یہ کس طرح باور کرتے ہو کہ زمین کے دیوتا الگ اور آسمان کے دیوتا الگ ہیں، اگر اس طرح ہر چیز کی خدائیاں الگ الگ تقسیم ہوتیں تو اس کارخانۂ کائنات میں ایسی حیرت انگیز سازگاری کس طرح پیدا ہوتی کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اس پانی کی بدولت اپنے تمام خزانے اگل دیتی اور پھر انسان اور چرند پرند سب ان سے فائدہ اٹھاتے۔ بعض جگہ تمثیلی رنگ میں بارش اور اس کے اثرات کے اختلاف کو اس اختلاف کو نمایاں کرنے کے لیے پیش کیا ہے جو آسمانی ہدایت قبول کرنے کے معاملہ میں مختلف صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کے اندر نمایاں ہوتا ہے۔ ایک ہی بارش کہیں تو سبزے اور نباتات کی بانات بچھا دیتی ہے، کہیں خار و خس اور جھاڑیاں اگاتی ہے اور کہیں صاف چٹیل میدان چھوڑ دیتی ہے، اسی طرح فرمایا ہے کہ آسمانی ہدایت کی جو بارش نازل ہوتی ہے اس سے ساری طبیعتیں یکساں فیضیاب نہیں ہوتیں، بعض تو اس کے چھینٹے پڑتے ہی باغ و چمن کی طرح کھلکھلا اٹھتی ہیں، بعض شور زمینوں کے مانند مردہ ہی پڑی رہ جاتی ہیں اور بعض صرف ضلالت اور عداوت کی خار دار اور زہر بھری جھاڑیاں اُگاتی ہیں۔

ہواؤں اور بادلوں کی گردش کو بھی مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے۔ خدا کی رحمت اور پروردگاری کی شہادت تو ان سے واضح طور پر ملتی ہی ہے، خاص طور پر جو چیز قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے وہ ہوا کے تصرفات کے پردہ میں خدا کی رحمت اور اس کے عذاب کا ظہور ہے جس سے بالآخر ایک روز

جزا و سزا کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن نے اس پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اگر آسمان و زمین اور ابر و ہوا میں سے ہر ایک پر الگ الگ ارادوں کی کارفرمائی ہے تو ان مختلف عناصر کے اندر وہ ربط و تعلق کون پیدا کرتا ہے جس ربط و تعلق کے بغیر اس دنیا کا وجود اور بقا ناممکن ہے۔

یہاں ہمارا مقصود ان دلائل کی تفصیل نہیں ہے جو اوپر کے اجمالات کے اندر مضمر ہیں۔ ان دلائل کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا یا بیان کرنا ان مواقع ہی پر زیادہ موزوں رہے گا جن میں قرآن نے ان کی وضاحت کی ہے۔ یہاں ان اشارات سے ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن مجید نے یہ جو فرمایا ہے کہ ان چیزوں کے اندر آیات یعنی دلیلیں اور نشانیاں ہیں تو یہ بات یونہی نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت اجمال اور تفصیل کی مختلف شکلوں میں قرآن میں بیان ہوئی ہے اس وجہ سے ان اجمالات کو تفصیل کے آئینہ میں دیکھنا چاہیئے۔

آیت ۱۶۴ کے مطالب پر ایک خصوصی نظر

یہ تو اس آیت پر ایک عمومی نظر ہوگی۔ اب ہم اس پر ایک خصوصی نظر اس دعوے کو پیش نظر رکھ کر ڈالیں گے جو یہاں عنوان زیر بحث ہے۔ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ یہاں اصل چیز جو زیر بحث ہے وہ توحید ہے اور یہ آیت اس توحید کی دلیل کے طور پر وارد ہوئی ہے اس وجہ سے اس آیت کے تمام مذکورہ حقائق و لطائف سب ضمنی ہیں، نظم کلام کے پہلو سے اصلی چیز جو واضح کرنے کی ہے وہ یہی ہے کہ اس میں توحید کی دلیل کیا ہے چنانچہ اب ہم اختصار کے ساتھ اس کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس آیت پر اگر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس میں شروع سے لے کر آخر تک اس کائنات کے متقابل بلکہ متضاد اجزا و عناصر کا حوالہ دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اس حیرت انگیز اتحاد و توافق اور ان کی اس بے مثال ہم آمیزی و سازگاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو ان کے اندر اس کائنات کی مجموعی خدمت کے لیے پائی جاتی ہے۔ آسمان کے ساتھ زمین، رات کے ساتھ دن، کشتی کے ساتھ دریا۔ بظاہر دیکھیے تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ضدین کی نسبت رکھتے ہیں لیکن ذرا گہری نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اگر یہ ایک طرف ضدین کی نسبت رکھتے ہیں تو دوسری طرف اس کائنات کی خانہ آبادی کے نقطۂ نظر سے آپس میں زوجین کا سا ربط و اتصال بھی رکھتے ہیں۔ یہ آسمان اور اس کے چمکتے ہوئے سورج اور چاند نہ ہوں تو ہماری زمین کی ساری رونقیں اور بہاریں ختم ہوجائیں بلکہ اس کی ہستی ہی نابود ہوجائے۔ اسی طرح یہ زمین نہ ہو تو کون بتا سکتا ہے کہ اس فضائے لامتناہی کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کس کس کا گھر اجڑ کے رہ جائے۔ علیٰ ہذا القیاس، ہماری اور ہماری طرح اس دنیا کے تمام جانداروں کی زندگی جس طرح دن کی حرارت، تمازت، روشنی اور نشاط انگیزی کی محتاج ہے، اسی طرح شب کی خنکی، لطافت، سکون بخشی اور خواب آوری کی بھی محتاج ہے۔ یہ دونوں مل کر اس گھر کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سمندر کو دیکھیے اس کا پھیلاؤ کتنا ہوشربا اور ناپیدا کنار ہے اور اس کی موجیں کتنی مہیب اور ہولناک ہیں، لیکن دیکھیے اس سرکشی و طغیانی کے باوجود کس طرح اس نے عین اپنے سینہ پر سے ہماری کشتیوں اور ہمارے جہازوں کے

لیے نہایت ہموار اور صاف سڑکیں نکال رکھی ہیں جن پر ہمارے جہاز دن رات دوڑ رہے ہیں اور تجارت معیشت، تمدن و معاشرت اور علوم و فنون ہر چیز میں مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملائے ہوئے ہیں۔

آگے آسمان سے بارش اور اس بارش سے زمین کے ازسرِنو باغ و بہار اور معمور و آباد ہو جانے کا ذکر ہے۔ غور کیجیے کہاں زمین ہے اور کہاں آسمان۔ لیکن اس دوری کے باوجود دونوں میں کس درجہ گہرا ربط و اتصال ہے۔ زمین اپنے اندر روئیدگی اور زندگی کے خزانے چھپائے ہوئے ہے لیکن یہ سارے خزانے اس وقت تک مدفون ہی رہتے ہیں جب تک آسمان سے بارش نازل ہو کر ان کو ابھار نہیں دیتی۔ اسی طرح کا رشتہ بادلوں اور ہواؤں کے درمیان ہے۔ بادلوں کے جہاز لدے پھندے اپنے بادبان کھولے کھڑے ہیں لیکن یہ اپنی جگہ سے ایک انچ سرک نہیں سکتے جب تک ہوائیں ان کو دھکے دے کر ان کی جگہ سے نہ ہلائیں اور ان کو ان کی متعین کی ہوئی سمتوں میں آگے نہ بڑھائیں، یہ ہوائیں ہی ہیں جو ان کو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ہنکائے پھرتی ہیں اور جب چاہتی ہیں ان کو غائب کر دیتی ہیں اور جب چاہتی ہیں ان کو افق پر نمودار کر دیتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ غور و تدبر کی نگاہ اس دنیا کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔ کیا یہ اضداد اور متناقضات کی ایک رزم گاہ ہے جس میں مختلف ارادوں اور قوتوں کی کشمکش برپا ہے یا ایک ہی حکیم و مدبر ارادہ ان سب پر حاکم و فرمانروا ہے جو ان تمام عناصر مختلفہ کو اپنی حکمت کے تحت ایک خاص نظام اور ایک مجموعی مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے یہ دوسری ہی بات ثابت ہوتی ہے۔ پھر مزید غور کیجیے تو یہیں سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے وہ یہ کہ یہ دنیا آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی ہے اور نہ اس کے اندر جو ارتقا ہوا ہے وہ آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے عناصر مختلفہ میں ایک بالاتر مقصد کے لیے وہ سازگاری کہاں سے پیدا ہوتی جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔

غور کیجیے تو یہ ایک ہی حقیقت ایک طرف شرک کے تمام امکانات کا سدّباب کر رہی ہے اور دوسری طرف، یہ ڈارونزم کے بھی تمام وساوس کی جڑ کاٹ رہی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ (۱۶۵)

یعنی توحید کی اس واضح دلیل کے باوجود جو اوپر بیان ہوئی اس دنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو خدا کے شریک اور ساجھی ٹھہراتے ہیں اور ان شریکوں اور ساجھیوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے۔ یہ اندازِ کلام اظہارِ تعجب کا ہے۔ یعنی اس بے عقلی کے لیے کوئی گنجائش

تو موجود نہیں تھی لیکن جو لوگ اپنی عقل سے کام ہی نہیں لیتے ان کا کیا علاج، ان کے لیے آسمان و زمین میں پھیلی ہوئی ساری دلیلیں بے کار ہیں!

محبت کا اصل حق دار اللہ ہے

ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے مزعومہ شریکوں اور ساجھیوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنے کا حق ہے حالانکہ محبت کا اصلی حقدار اللہ ہی ہے، وہی ہے جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے، وہی ہے جس کے ہاتھ میں سارا انتظام ہے اور اس کائنات کے ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی ربوبیت و رحمت سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ وہ رحمان و رحیم ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا اس کے برابر کی محبت کا حقدار کس طرح ہو سکتا ہے۔ پھر کوئی دوسرا کسی نسبت اور تعلق کی وجہ سے محبت کا حق دار نکلے بھی تو بہر حال اس کی محبت خدا کی محبت کے تحت ہی ہو سکتی ہے نہ کہ اس کے برابر یا خدانخواستہ اس سے زیادہ۔ اس سے جہاں یہ بات نکلی کہ محبتِ حقیقی خدا کے حقوق میں سے ہے۔ اس میں کسی اور کو شریک کرنا شرک ہے وہیں یہ بات بھی نکلی کہ دوسروں کے لیے محبت کی مطلق نفی نہیں ہے۔ دوسروں سے بھی محبت کی جا سکتی ہے مثلاً بیوی، بچوں، قوم، قبیلہ اور ملک و وطن سے یا کسی بزرگ یا استاذ یا شیخ یا پیر سے لیکن اس محبت کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ خدا کی محبت کے تابع ہو یعنی جہاں کہیں اور جب کبھی اس محبت اور خدا کی محبت کے تقاضوں میں کوئی ٹکراؤ ہونے لگے تو آدمی خدا کی محبت کے تقاضے کو مقدم رکھے اور دوسری محبتوں کو نظر انداز کر دے۔ اس صورت میں بلاشبہ وہ توحید کا حق ادا کرنے والا ٹھہرے گا۔ چنانچہ حقیقی اہلِ ایمان کی یہی شان بیان ہوئی ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (جو حقیقی ایمان رکھتے ہیں وہ خدا کی محبت میں سخت تر ہوتے ہیں) یعنی جب ان کے سامنے اللہ اور غیر اللہ کی محبت کے ایک دوسرے سے متضاد مطالبات ابھرتے ہیں تو وہ ہمیشہ محبتِ الٰہی کے پہلو کی طرف جھکتے ہیں۔ یہی توحید خالص کی حقیقت اور یہی چیز ایمان کی روح ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک محبت کے ہونے کا تعلق ہے، یہ اللہ کے ساتھ ساتھ دوسروں سے بھی ہو سکتی ہے، یہ چیز ایمان اور توحید کے منافی نہیں ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ دوسروں کی محبت اللہ کی محبت کے تابع ہو، اس کے برابر یا اس سے بڑھ کر نہ ہو۔

وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا الآیۃ۔ یہاں عربی زبان کے عام قاعدہ کے مطابق لَوْ کا جواب محذوف ہے اور اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا اور اس کے بعد کے الفاظ اس محذوف جواب کی وضاحت کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اپنی جانوں پر یہ ظلم ڈھانے والے لوگ جو خدا کے ہمسر اور شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں اور ان سے خدا کی طرح محبت کر رہے ہیں اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ وہ عذابِ الٰہی سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ خدا کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں جو اس کے برابر کی محبت کا حق دار ہو بلکہ وہی تنہا تمام قوت و اختیار کا مالک ہے اور وہ اپنے ساتھ شریک کرنے والوں کو

نہایت سخت عذاب دینے والا ہے جس سے ان کو کوئی بھی بچانے والا نہ ہوگا۔

اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں، ہم بقصد اختصار صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ	اگر آج جان سکتے یہ کفر کرنے والے اس وقت کو
لَا يَكُفُّونَ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا	جب کہ یہ اپنے چہروں اور اپنی پیٹھوں سے آگ کو
عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝	دفع نہ کر سکیں گے اور نہ اس وقت ان کی کوئی مدد
(۳۹ - انبیاء)	کی جائے گی۔

اس آیت میں بھی 'لو' کا جواب محذوف ہے۔ یعنی اگر آج یہ اس عذاب کو جان سکتے جس کو آخرت میں جائیں گے تو یہ اس سرکشی کا اظہار نہ کرتے جس کا اظہار کر رہے ہیں لیکن یہ اس کو اس وقت جانیں گے جب یہ جاننا کچھ نفع نہ بخشے گا بلکہ صرف باعثِ حسرت واندوہ ہوگا۔ سورۂ سبا میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ (۱۶۶)

یہ "اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ" سے بدل پڑا ہوا ہے اور اسی عذاب کی مزید وضاحت کر رہا ہے کہ آج جن کو یہ خدا کا شریک وہمسر ٹھہراتے ہیں اور جن سے اس طرح محبت کر رہے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیئے، جب عذاب آخرت ظاہر ہوگا تو یہ اپنے ان جاں نثاروں اور پیروؤں سے صاف صاف اظہارِ برأت کر دیں گے اور اس عذاب سے بچانے میں ان کے کچھ کام نہ آئیں گے جو ان کے سر پر کھڑا ہوگا۔

'اسباب' کا مفہوم

اسباب، سبب کی جمع ہے جس کے اصل معنی رسی کے ہیں، پھر یہیں سے اس کے اندر تعلق وتوسل اور اسباب ووسائل کا مفہوم پیدا ہوا اور پھر مزید وسعت پا کر کسی شے کے متعلقات واطراف کے لیے بھی اس کا استعمال ہونے لگا چنانچہ قرآن میں اسباب السماء کی ترکیب استعمال ہوتی ہے۔ 'بِهِمْ' کی ضمیر الَّذِينَ اتُّبِعُوا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین نے جن لوگوں کو شریک وشفیع سمجھ کر ان کے ساتھ تعلقاتِ محبت وارادت قائم کر رکھے ہیں ایک دن ان کے ان تعلقات کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور یہ ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں گے۔

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ (۱۶۷)

متبوعین اور تابعین

متبوعین کے بعد اب یہ تابعین کا ردِ عمل بیان ہو رہا ہے کہ جب پیرو دیکھیں گے کہ جن کو انھوں نے خدائی کا درجہ دیا اور زندگی بھر جن کو اپنی تمام محبتوں اور نیاز مندیوں کا سزاوار جانا وہ اس سب سے مشکل وقت میں اس طرح اظہارِ بیزاری کر رہے ہیں تو وہ بھی نہایت حسرت کے انداز میں کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک بار پھر دنیا میں جانا نصیب ہو کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہارِ بیزاری کر سکیں جس طرح انھوں نے

سے ہم سے اظہار بیزاری کیا ہے۔ لیکن ان کی یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی، جس عذاب میں وہ پڑ چکے ہوں گے اس سے ان کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ یہاں ہم اس کی وضاحت کے لیے بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا (۲۵- عنکبوت)	اور یہ جو تم خدا کو چھوڑ کر دوسرے بت بنائے بیٹھے ہو تو یہ محض اس دنیا کی زندگی میں دوستی کے لیے ہیں، پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔
وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا (۶۷-۶۸ احزاب)	وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور لیڈروں کی بات مانی تو انھوں نے ہمیں راستے سے بھٹکایا۔ اے ہمارے پروردگار ان کو دونا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت کر۔
الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (۶۷- زخرف)	دنیا کے دوست اس دن سب ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے! صرف متقی اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

یہاں یہ جو فرمایا ہے کہ ان کے اعمال، اللہ تعالیٰ ان کو سرمایۂ حسرت بنا کر دکھائے گا تو اس سے مراد ہمارے نزدیک ان کی وہ وفاداریاں اور قربانیاں ہیں جو ان مشرکین نے اپنے ان باطل معبودوں یا اپنے ان گمراہ کرنے والے سرداروں اور لیڈروں کے لیے کی ہوں گی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (۱۶۸)

یہ خطاب عربوں سے ہے جن کے شرک کی طرف اوپر کی آیات میں اشارہ کیا تھا۔ پہلے توحید کے سلسلہ میں ان کی بدعات سے تعرض کیا ہے۔ پھر آگے چل کر اہل کتاب کی بدعات کی تردید کی ہے۔ عربوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ زمین کی چیزوں میں سے جو جائز و پاکیزہ چیزیں ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ شیطان کے نقش قدم کی پیروی سے مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنے جی سے محض اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت جو حلال و حرام ٹھہرا رکھے ہیں ان کی کوئی شرعی سند نہیں ہے، بلکہ یہ راہ تمھیں شیطان نے سجھائی ہے اور تم نے اس کی پیروی میں خدا کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا اور اس طرح خدا کے

حق تحریم و تحلیل میں مداخلت کر کے شرک کے مرتکب ہوئے۔

حکم الٰہی کے بغیر تحلیل و تحریم شرک ہے

چونکہ خدا کے حکم کے بغیر تحریم و تحلیل شرک ہے اس وجہ سے قرآن میں شرک اور تحریم و تحلیل کا مضمون جگہ جگہ ایک ساتھ بیان ہوا ہے مثلاً سورہ نحل میں ہے وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ وَلَا حَرَّمْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ (۳۵) (اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی چیز کو پوج سکتے اور نہ اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے) اسی طرح سورہ انعام ۱۴۸ میں ہے۔ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ (یہ مشرک کہیں گے، اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور ہمارے آبا و اجداد کسی چیز کو اس کا شریک بنا سکتے اور نہ کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے)

اس سے معلوم ہوا کہ شرک اور تحریم و تحلیل دونوں ایک دوسرے سے متعلق مضمون ہیں۔ اسی تعلق سے آیت زیر بحث میں بھی شرک کی تردید کے سلسلہ میں یہ بات فرمائی گئی کہ تمام جائز و پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کی پیروی میں مشرکانہ توہمات کے تحت خدا کی جائز کردہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ۔ رہی یہ بات کہ شیطان کی پیروی میں مشرکین عرب نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت کن چیزوں کو حرام یا حلال ٹھہرا یا تھا تو اس کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ○ وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ○ وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَن نَّشَاءُ	اور جو کھیتیاں اور چوپائے خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں ان میں انھوں نے اپنے شرکا کے ساتھ ساتھ خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں، یہ تو اللہ کے لیے ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ ہمارے شرکا کے لیے ہے۔ تو جو حصہ ان کے شرکا کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا اور جو اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکا کو منتقل ہو سکتا ہے، کتنا برا فیصلہ یہ کرتے ہیں! اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکا نے قتل اولاد کو ایک پسندیدہ فعل بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہ کریں اور ان کے دین کو گھپلا کر کے رکھ دیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ کچھ وہ نہ کر پاتے تو ان کو اور ان کے اس افترا کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں قسم کی فصلیں ممنوع ہیں، ان کو صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جن کو ہم اجازت دیں۔

بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا
وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا
افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَا فِيْ
بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ
لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا
وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَاۗءُ
سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ
عَلِيْمٌ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا
اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا
مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى
اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا
مُهْتَدِيْنَ (۱۳۸-۱۴۰ انعام)

ان کے گمان کے مطابق۔ کچھ چوپائے ایسے ہیں جن
کی پیٹھیں حرام قرار دے دی گئی ہیں اور کچھ پر اللہ کا
نام نہیں لیتے۔ یہ محض اللہ پر ان کا افترا ہے۔ اللہ
ان کو ان کے اس افترا کا بدلہ دے گا اور یہ کہتے ہیں
کہ فلاں فلاں چوپایوں کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ صرف
ہمارے مردوں ہی کے لیے جائز ہے، ہماری عورتوں کے
لیے یہ ناجائز ہے اور اگر وہ مردار ہو تو دونوں اس میں
شریک ہو سکتے ہیں۔ اللہ ان کو ان کی اس تشخیص کا بدلہ
چکھائے گا، وہ حکیم و علیم ہے۔ نامراد ہوئے وہ لوگ جنھوں
نے اپنی اولاد کو قتل کیا، محض بے وقوفی سے، بغیر کسی علم
کے اور اللہ کے بخشے ہوئے رزق کو حرام ٹھہرایا محض اللہ
پر افترا کر کے۔ یہ لوگ گمراہ ہوئے اور ہدایت حاصل کرنے
والے نہ بنے۔

اسی طرح مشرکین نے بعض قسم کے چوپایوں کو اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت یا اپنے بتوں کی نسبت سے تقدیس کا درجہ دے دیا تھا جن پر کسی قسم کا تصرف وہ ناجائز خیال کرتے تھے۔ قرآن نے ایک جگہ اس کی تردید کی ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَاۗىِٕبَةٍ
وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰۳ - مائدہ)

اور یہ بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام خدا نے مشروع
نہیں ٹھہرائے ہیں بلکہ یہ کافر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں
جو کہتے ہیں کہ خدا نے مشروع کیے ہیں، اور ان میں سے
اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔

ایک اور مقام پر ان کی اس مشرکانہ تحریم و تحلیل پر بدیں الفاظ گرفت فرماتی ہے۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ
كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ
مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ
قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ
اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ

اور چوپایوں میں سے بوجھ اٹھانے والے بھی پیدا کیے
اور زمین سے لگے ہوئے بھی۔ خدا نے جو تمھیں بخشے ہیں
ان میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ
کرو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ آٹھ ان
چوپایوں کی آٹھوں قسموں کو لو۔ بھیڑوں میں سے دو اور
بکریوں میں سے دو۔ پھر پوچھو ان سے کہ خدا نے ان کے
نروں کو حرام ٹھہرایا ہے یا ماداؤں کو یا ان بچوں کو جو

نَبِّئُونِي بِعِلْمٍ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝
وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ
اثْنَيْنِ قُلْ آلذَّكَرَيْنِ
حَرَّمَ أَمِ الْأُنْثَيَيْنِ أَمَّا اشْتَمَلَتْ
عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنْثَيَيْنِ، أَمْ كُنْتُمْ
شُهَدَاءَ إِذْ وَصَّاكُمُ اللَّهُ بِهَٰذَا
فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ
كَذِبًا لِيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ
اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝
قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا
عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ
مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ
لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ
أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ
بِهِ (۱۴۳-۱۴۵ - انعام)

ان ماداؤں کے پیٹوں میں ہیں۔ کہو کہ مجھے کسی سند کے
ساتھ بتاؤ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو۔
اور اسی طرح دو اونٹوں میں سے اور دو گایوں
میں سے لو اور ان سے پوچھو کہ ان کے نروں کو حرام
کیا ہے یا ان کی ماداؤں کو یا ان کو جو ان ماداؤں کے
پیٹوں میں ہیں۔ ان سے پوچھو کیا تم اس وقت موجود
تھے جب خدا نے تمھیں ان باتوں کا حکم دیا ؟ تو ان سے
بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو خدا پر جھوٹا بہتان لگائیں
تاکہ لوگوں کو کسی علم و سند کے بغیر گمراہی میں مبتلا کریں۔
خدا ظالموں کو کبھی راہ یاب نہیں کرے گا۔ کہہ دو مجھ پر
جو وحی ہوئی ہے اس میں تو میں کسی کھانے والے پر
بجز اس کے کوئی چیز حرام نہیں پاتا کہ یا تو مردار ہو یا
بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت۔ یہ چیزیں نجس ہیں۔ یا
کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، خدا کے حکم
کی نافرمانی کرتے ہوئے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آیت زیر بحث میں شیطان کے نقش قدم کی پیروی سے مراد یہی مشرکانہ توہمات کے تحت اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرانا ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ شیطان اور اس کی ذریات کو خاص اس مسئلہ سے بڑی دلچسپی ہے۔ اس نے لوگوں کو توحید کے راستے سے ہٹانے کے لیے اس راستے کو بہت کامیاب اور آسان پایا ہے۔ اس وجہ سے شروع ہی سے اس کو اپنے پروگرام میں شامل کر کے پوری جرأت اور صفائی کے ساتھ اس کا اعلان بھی کر رکھا ہے۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت پر غور فرمائیے۔

وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا
مَفْرُوضًا ۝ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ
وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ
فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ وَمَنْ يَتَّخِذِ
الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُونِ اللَّهِ
فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا
(۱۱۹ - نساء)

اور شیطان نے کہا کہ میں تیرے بندوں میں سے اپنا ایک
متعین حصہ الگ کر کے رہوں گا۔ میں ان کو گمراہ کروں گا،
ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا اور ان کو سجھاؤں گا
تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سجھاؤں گا
تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کریں گے اور جو
اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا کارساز بنائے گا تو وہ کھلی ہوئی
نامرادی میں مبتلا ہوا۔

آیت میں حلال کے ساتھ طیب کی صفت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلام میں جو چیزیں جائز ہیں وہ لازماً پاکیزہ بھی ہیں۔ گویا ہر چیز کے ساتھ جواز و عدم جواز کے امتیاز کے لیے جس طرح ایک شرعی اور قانونی معیار ہے اسی طرح ایک عقلی اور فطری معیار بھی ہے۔ جو چیزیں ظاہری گندگی اور عقلی و اخلاقی مفاسد سے آلودہ نہیں ہیں وہ سب چیزیں حلال ہیں، اس کے برعکس جن چیزوں کے اندر کوئی ظاہری یا باطنی گندگی موجود ہے وہ ناجائز ٹھہرا دی گئی ہیں۔

شیطان کے لیے 'عدو مبین' کی صفت

شیطان کے لیے 'عدو مبین' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ بنی نوع آدم کے ساتھ اس کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ وہ روزِ اول سے آدم اور ان کی ذریت کا دشمن ہے اور اپنی اس دشمنی کا قیامت تک کے لیے کھلم کھلا اعلان بھی کر چکا ہے۔ اوپر ہم ایک آیت سورۂ انعام کی نقل کر آئے ہیں جس سے واضح ہے کہ وہ اپنی اس دشمنی کا خود اللہ تعالیٰ کے سامنے پوری جسارت کے ساتھ اظہار کر چکا ہے۔ اسی مضمون کی ایک دوسری آیت بھی ملاحظہ ہو۔

قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝
قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ
عَلَىَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قَالَ
اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ
جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝
وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ
بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ
وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَ
الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ
الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝

(۶۱-۶۴ - بنی اسرائیل)

ابلیس بولا بھلا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؛ اس نے کہا یہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے! اگر تو نے مجھے قیامت تک کے لیے مہلت بخشی تو میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔ صرف تھوڑے ہی میرے فتنوں سے محفوظ رہ سکیں گے خدا نے فرمایا، جا، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے تو جہنم تمہارا پورا پورا بدلہ ہے۔ تو ان میں سے جن کو اپنے شور و غوغا سے گھبرا سکے ان کو گھبرا لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے اور ان کے مال و اولاد میں شریک بن جا اور ان کو وعدوں کے سبز باغ دکھا لے اور شیطان کے یہ وعدے فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔

ایک دوسرے مقام میں شیطان کے الٹی میٹم کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ
وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ

بولا، بوجہ اس کے کہ تو نے آدم کے سبب سے مجھے گمراہی میں ڈالا، میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے دہنے سے، ان کے بائیں سے ان کی

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ٥ (۱۶-۱۷- اعراف) راہ ماروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا۔

جو دشمن اتنے کھلے ہوئے الفاظ میں اعلان جنگ دے چکا ہو اس کے ایک کھلے ہوئے دشمن (open - Enemy) ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس کو "عدوٌ مبینٌ" سے تعبیر کیا ہے اور مقصود اس سے بنی آدم کو آگاہ کرنا ہے کہ ایک چھپے ہوئے دشمن سے دھوکا کھا جانا تو کچھ بعید نہیں ہوتا لیکن ایک کھلے ہوئے دشمن سے دھوکا کھا جانا، یہاں تک کہ اس کو دوست اور کارساز سمجھ کر اس کے مشوروں پر کاربند ہونا ایک ایسی حماقت ہے جس سے بڑی حماقت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶۹)

امر کے معنی — 'امر' کے معنی جس طرح کسی بات کا حکم دینے کے ہیں اسی طرح کوئی بات سجھانے یا اس کا مشورہ دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً

امرتهم امری بمنعرج اللوی فلم یستبینوا الرشد الاضحی الغد

(میں نے ان کو اپنے مشورے سے منعرج اللوی ہی میں آگاہ کر دیا تھا لیکن میری بات ان کی سمجھ میں دوسرے دن کی صبح سے پہلے نہ آ سکی)۔

یا

اطعت لآمریك بصرم حبلی

(تو نے بالآخر انھی لوگوں کی بات سنی جو تجھے مجھ سے قطع تعلق کا مشورہ دینے والے تھے)۔

'سُوْء' کا استعمال وسیع معنوں میں — 'سُوْء' کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے جسمانی اور مادی نقصان اور گزند بھی مراد ہوتا ہے مثلاً فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ -۱۷۳- آل عمران (اور وہ خدا کی نعمت اور اس کا فضل لے کر لوٹے اور ان کو کوئی گزند نہ پہنچا) اس سے بیماری بھی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۱۲- نمل (اور تم اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کرو، وہ اس کے اندر سے سفید برآمد ہو گا بغیر کسی مرض کے) اسی طرح یہ بدی اور گناہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، عام اس سے کہ بدی چھوٹی ہو یا بڑی مثلاً اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ ۱۷- نساء (اللہ کے ذمہ ان کی توبہ کی قبولیت ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھیں پھر فوراً توبہ کر لیں)

'فحشاء' کا مفہوم — فَحْشَاء کا لفظ کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں اس سے زنا، لواطت اور ننگے ہو کر طواف کرنے کی قسم کی برائیوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ جب سُوْء اور فحشاء دونوں لفظ ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تو یہ نہ صرف تمام چھوٹی بڑی برائیوں ہی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں بلکہ ہر طرح کے مالی، جسمانی اور عقلی نقصانات و مصائب بھی ان کے تحت آ جاتے ہیں۔

قول علی اللہ اور افترا علی اللہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی خدا کی طرف کوئی جھوٹی اور من گھڑت بات منسوب کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خدا نے فلاں اور فلاں کو اپنا ساجھی اور شریک قرار دیا ہے یا بغیر کسی سند کے یہ دعوے کرنا کہ خدا نے فلاں فلاں قسم کی چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔

شیطان کے امر کرنے سے یہاں مطلب اس کا ان باتوں کے لیے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنا اور لگاتار ان کو کھپانا ہے۔ شیطان کے مفہوم میں اس کی ساری ذریت شامل ہے، عام اس سے کہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ یہی مضمون ایک دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے۔ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۱۲۱- انعام (اور وہ چیزیں نہ کھاؤ جن پر خدا کا نام نہیں لیا گیا ہے، بے شک شیاطین اپنے دوستوں کی طرف القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے)

ایک نکتہ

یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ رحمان اور شیطان کے احکام میں ایسا واضح اور محسوس عقلی و فطری امتیاز موجود ہے کہ کسی سلیم الفطرت اور خوش ذوق انسان کو ان کے درمیان کوئی گھپلا پیش نہیں آ سکتا۔ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں کھانے پینے کے لیے جائز ٹھہرائی ہیں وہ اپنے اثرات اپنے ظاہر، اور اپنے باطن کے لحاظ سے پاکیزہ، خوشگوار، معتدل، صحت بخش اور روح پرور ہیں، اس کے بالمقابل شیطان جن باتوں کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے وہ سب کی سب روح، عقل، جسم اور اخلاق کو نقصان پہنچانے والی اور بے حیائی و بدکاری کی راہیں کھولنے والی ہیں۔ اس واضح فرق کے بعد بھی جو لوگ شیطان کی پیروی اختیار کریں ان کی شامت ہی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۱۷۰)

تقلید کے ساتھ ماضی کے ورثہ کا احترام

یعنی ان تمام مشرکانہ رسوم کے معاملہ میں ان کا اعتماد کسی دلیل اور سند پر نہیں بلکہ محض پچھلوں کی تقلید اور ان کی بے سند روایات کی پیروی پر ہے اور جب ان کو اس بات کی دعوت دی جاتی ہے کہ ان بے سند باتوں کی جگہ اس کتاب کی پیروی کرو جو خدا کی اصل شریعت سے آگاہ کرنے کے لیے تم پر نازل کی جا رہی ہے تو وہ بڑے غرور کے ساتھ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو بدستور اپنے باپ دادا کے طریقے پر جمے رہیں گے۔ اس پر قرآن نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا باپ دادا کے طریقے کی پیروی پر ان کا یہ جمود اور اصرار اس شکل میں بھی معقول قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ یہ واضح ہو کہ ان کے باپ دادا نے نہ تو ان معاملات میں عقل کی رہنمائی پر اعتماد کیا ہے نہ خدا کی تعلیم پر بلکہ یا تو بے سمجھے بوجھے پچھلوں کی لکیر پیٹتے رہے ہیں یا اپنی خواہشات اور شیطان کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کی ہیں؟

قرآن کے اس سوال کے انداز سے یہ بات نکلتی ہے کہ مجرد یہ چیز کہ ایک بات باپ دادا سے چلی آرہی ہے اس کی صحت و صداقت ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر اس کو رکھ کر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ بات اگر مجرد عقل و رائے سے تعلق رکھنے والی ہے تو وہ عقل کی میزان پر پوری اترتی ہے یا نہیں اور اگر دین سے تعلق رکھنے والی ہے تو اس کی کوئی مضبوط اور قابلِ اعتماد سند ہے یا نہیں، گویا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ قرآن ایک طرف تو مجرد تقلید پر اعتماد کرنے کے بجائے تحقیق اور تنقید کے لیے برابر آنکھیں کھولے رکھنے کی دعوت دیتا ہے، دوسری طرف وہ ماضی کے ورثہ کو احترام کی نگاہ سے دیکھنے کی بھی ہدایت کرتا ہے اور بغیر تحقیق و تنقید اس سے دستبردار ہو جانے کی اجازت نہیں دیتا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۚ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۷۱)

'نعق ینعق' کے معنی

نَعَقَ يَنْعِقُ کے معنی چیخنے اور آواز دینے کے آتے ہیں۔ نعق المؤذن کے معنی ہیں مؤذن نے اذان دی۔ نعق الراعی بغنمہ کے معنی ہیں چرواہے نے اپنے گلے کو للکارا یا پکارا۔

صورتِ حال کی تمثیل صورتِ حال

یہ ایک تمثیل ہے جس میں ایک صورتِ حال کی تمثیل دوسری صورتِ حال سے دی گئی ہے۔ اس طرح کی تمثیلات میں، جیسا کہ ہم آیات ۱۷-۱۸ کی تمثیلات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں، ممثل اور ممثل بہ کے تمام اجزا کی ایک دوسرے سے مطابقت ضروری نہیں ہوتی بلکہ صرف صورت واقعہ کی صورت واقعہ سے مطابقت ضروری ہوتی ہے۔ نیز اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ جس چیز کی تمثیل دی جا رہی ہے اس کی پوری صورت واضح کی جائے بلکہ صرف اس صورتِ واقعہ کی وضاحت ضروری ہوتی ہے جس سے تمثیل دی جاتی ہے۔ اسی کے آئینہ میں اس کا عکس بھی دیکھ لیتے ہیں جس کی تمثیل پیش کرنی مقصود ہے۔

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے اندھے بہرے ہو کر محض باپ دادا کی تقلید پر اڑ گئے ہیں ان کی تشبیہ بھیڑ بکریوں کے گلے سے دی گئی ہے جو عقل و ادراک سے بالکل عاری اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہوتا ہے۔ چرواہے کی آواز بے شک اس کے کانوں سے جا ٹکراتی ہے لیکن اس سے آگے اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ چرواہا کس کام کے لیے پکار رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ اس تمثیل کے بعد فرمایا کہ "یہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں" جس سے مقصود اس امر کی وضاحت ہے کہ یہ تمثیل تمام عقلی اور روحانی تقاضوں سے ان کی محرومی کی تمثیل ہے۔ اس اسلوب کی بعض بلاغتیں آیت ۱۸ کے تحت بھی گزر چکی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۷۲)

مسلمانوں کے تردد کا ازالہ

مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا اگر یہ مشرکین اپنی مشرکانہ بدعات پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور تم ان ناروا پابندیوں کو اٹھا کر ان تمام پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں۔ پھر فرمایا اگر تم اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو اسی کے شکر گزار بنو۔ اس کے بخشے ہوئے رزق اور اس کے پیدا کیے

ہوئے چوپایوں کو کسی اور کی نسبت سے حرام ٹھہرانا خدا کی بندگی کے بھی منافی ہے اور اس کی شکر گزاری کے بھی۔

مسلمانوں کو خاص طور پر مخاطب کرکے یہ بات کہنے کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ کھانے پینے کا معاملہ، بالخصوص جب کہ ایسی چیزوں کے کھانے کا معاملہ ہو جن کو پرانے زمانہ سے مذہبی تقدس کی بنیاد پر حرمت کا درجہ حاصل رہا ہو، ایک نازک معاملہ تھا۔ اس طرح کے معاملات میں انسان کچھ شکی اور وہمی سا بن جاتا ہے۔ روایت کے خلاف کسی چیز کے کھانے سے طبیعت میں نہ صرف یہ کہ ایک قسم کی جھجک پیدا ہوتی ہے بلکہ بعض لوگ اس کو تقویٰ اور دینداری کے بھی خلاف سمجھتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ حالت کچھ مسلمانوں کو بھی پیش آئی اس وجہ سے قرآن نے ان کو یہ تنبیہ کی کہ یہ چیز خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی کے منافی ہے۔

سورۂ انعام کے بعض مقامات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کی حرام کردہ چیزوں کو جب قرآن نے مباح کر دیا کہ اللہ کے نام پر ذبح ہونے کی صورت میں تم ان کو شوق سے کھاؤ تو مشرکین نے یہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے ان چیزوں کو بھی حلال کر دیا ہے جو باپ دادا کے زمانوں سے حرام چلی آرہی تھیں، چونکہ اس طرح کے معاملات میں طبیعتیں، جیسا کہ اوپر گزرا، بڑی حساس ہو جاتی ہیں اس وجہ سے کچھ مسلمانوں پر اس پروپگنڈے کا اثر ہوا۔ سورہ انعام کی آیات ذیل میں اسی پروپگنڈے کا رد ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ○ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ○ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ○ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ○ (۱۱۸-۱۲۱ - انعام)

پس جس پر اللہ کا نام ذبح کے وقت لے لیا گیا ہو ان کو بے جھجک کھاؤ، اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہو۔ اور آخر تم ان چیزوں کو کیوں نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے جب کہ وہ چیزیں تمہارے سامنے وضاحت سے بیان کی جا چکی ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں الا آنکہ تم ان میں سے بھی کسی چیز کے کھانے پر مجبور ہو جاؤ۔ بہت سے لوگ اپنی من گھڑت باتوں کی آڑ لے کر بغیر کسی علم کے لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کو۔ گناہ ظاہر اور گناہ باطن دونوں سے باز آؤ۔ جو لوگ گناہ کی کمائی کر رہے ہیں وہ اپنی کمائی کا عنقریب بدلہ پائیں گے۔ ہاں ان چیزوں میں سے نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، یہ خدا کی نافرمانی ہے۔ اور یہ شیاطین ہیں جو اپنے دوستوں کو القا کر رہے ہیں تاکہ وہ تمہارے ساتھ بحثیں اٹھائیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے۔

ہمارے نزدیک آیت زیر بحث بھی بالکل اسی موقع و محل میں اور مسلمانوں کے سامنے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے وارد ہوئی۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱۷۳)

ملتِ ابراہیم میں حرام و حلال

یہ اشارہ ہے ان چیزوں کی طرف جو اصلاً ملتِ ابراہیمؑ میں حرام ٹھہرائی گئی تھیں اور مقصود اس سے ہرگز ہرگز حرام و حلال کی تفصیل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ صرف مشرکین کی تردید ہے کہ انھوں نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت چوپایوں میں سے بعض کو جو حرام قرار دے دیا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، ملتِ ابراہیمؑ میں صرف یہ چیزیں حرام تھیں۔ بالکل اسی سیاق میں یہی بات سورۂ انعام میں اس طرح فرمائی گئی ہے۔ قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ۔ ۱۴۵ (کہہ دو کہ مجھے جو وحی کی گئی ہے اس میں تو کسی کھانے والے کے لیے میں بجز اس کے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت، یہ چیزیں ناپاک ہیں، یا پھر خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے)

"قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ" کے الفاظ پر ان کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مشرکین کے سامنے اس بات کی وضاحت کرائی جا رہی ہے کہ تم نے جو بعض چوپایوں کی حرمت کو ملتِ ابراہیمؑ کی نسبت دے رکھی ہے یہ بالکل بے سند بات ہے مجھ پر ملتِ ابراہیم کے ضابطۂ حلت و حرمت سے متعلق جو بات وحی کی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ فلاں فلاں چیزوں کے سوا چوپایوں میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں ٹھہرائی گئی۔

بعض لوگ زیر بحث آیت کو اس کے موقع و محل سے بالکل الگ کر کے اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں بس یہی چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے لیکن یہ خیال بھی بالکل غلط ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی تردید کے لیے دوسری باتوں سے قطع نظر تنہا یہی بات کافی ہے کہ زیر بحث آیت میں "میتہ" کا جو لفظ آیا ہے سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں اس کی وضاحت میں پانچ چیزیں گنائی گئی ہیں۔ پھر مزید بعض دوسری چیزوں کی بھی حرمت بیان ہوئی ہے جن کی طرف آیت زیر بحث میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

ظاہری گندگی اور باطنی گندگی

ان بیان کردہ چیزوں میں سے مردار، خون اور لحم خنزیر کی حرمت تو ان کی ظاہری گندگی کے سبب سے ہے اس لیے کہ اسلام میں صرف پاکیزہ چیزیں ہی، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، حلال ٹھہرائی گئی ہیں، جو چیزیں دیکھنے ہی سے گندی اور نجس محسوس ہوتی ہیں ان کو اس دینِ فطرت میں حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ رہی غیر اللہ کے ذبیحہ کی حرمت، تو اس کی حرمت کی وجہ اس کی باطنی گندگی ہے۔ یہ حقیقت اسلام میں اپنی جگہ پر بالکل مسلّم

اور واضح ہے کہ شرک سب سے بڑی عقلی اور باطنی نجاست ہے اس وجہ سے اگر کسی پہلو سے اس کی چھوت کسی پاک چیز کو بھی لگ جاتی ہے تو وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔ ان دونوں قسموں کی نجاستوں کی طرف اشارہ خود قرآن ہی نے کر دیا ہے چنانچہ انعام ۱۴۵ میں مردار، خون اور لحم خنزیر کے ذکر کے بعد فرمایا کہ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ یہ چیزیں اس وجہ سے حرام ہیں کہ یہ نجس ہیں اور غیر اللہ کے ذبیحہ کا ذکر اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے الفاظ کے ساتھ کیا جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس کی نجاست ظاہری نہیں بلکہ عقلی اور عقائدی ہے۔ پھر سورۂ انعام میں انھی مسائل کے بیان کے سلسلہ میں دین کی یہ ایک بہت بڑی حقیقت بھی واضح کر دی کہ اسلام کا مطالبہ اپنے ہر پیرو سے صرف گناہ ظاہر ہی کے چھوڑنے کا نہیں ہے بلکہ گناہ باطنی کے چھوڑنے کے لیے بھی ہے اس وجہ سے ظاہر گندگی سے آلودہ چیزوں کے ساتھ ساتھ باطنی اور روحانی گندگی سے ملوث چیزوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (انعام) اسی ضابطہ کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض چیزوں کو حرام ٹھہرایا۔

'اضطرار' کا مفہوم

"اضطر" ضریضر سے باب افتعال ہے۔ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق "ض" کی مناسبت سے افتعال کی "ت" "ط" سے بدل گئی ہے۔ ضرہ الی کذا کے معنی ہیں الجاءہ الیہ اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر کے دھکیل دیا۔ اضطرہ الیہ کے معنی ہیں احوجہ والجاءہ اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر دیا۔ بغیٰ یبغی کے معنی یہاں چاہنے اور طلب کرنے کے ہیں۔ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ یہاں حال پڑے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ 'اضطرار' کے ساتھ مخمصہ کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو جائے تو وہ حرام کردہ چیزیں بھی جان بچانے کے لیے استعمال کر سکتا ہے لیکن یہ اضطرار واقعی ہو، نہ تو اس کے اندر حرام کی کسی چاہت کو دخل ہو اور نہ آدمی اس حد سے آگے بڑھنے والا ہو جس حد تک بڑھنا جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ ان احتیاطوں کے ساتھ کسی واقعی مجبوری میں اگر کوئی شخص کسی حرام چیز سے فائدہ اٹھائے تو فرمایا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

رخصت اور عزیمت

قرآن کے الفاظ سے یہ ظاہر ہے کہ یہ اس حالت اضطرار کے لیے ایک رخصت ہے جو غذا میسر نہ آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اسی پر قیاس کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص حالتِ اکراہ میں مبتلا ہو جائے وہ بھی اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن بعض فقہا نے اس حد سے بڑھ کر اس کو عزیمت کا درجہ دیا ہے۔ چنانچہ حنفیہ کے نزدیک تو وہ شخص خود کشی کا مجرم ٹھہرے گا جو اس طرح کے حالات میں حرام سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے گا۔ ہمارے نزدیک اس اجمال کے ساتھ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک تفصیل بھی ہے جس کے سامنے آئے بغیر اس سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہم آگے مستقل عنوان سے یہ تفصیل پیش کریں گے تاکہ رخصت و عزیمت کے معاملہ میں اسلام کا جو مزاج ہے وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ ۚۖ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۷۴)

اہل کتاب کی بعض تحریمات

یہ اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح مشرکین نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض چیزیں حرام ٹھہرالی تھیں اور اسلام کی طرف سے ان کی تحلیل کو خلافِ تقویٰ وطہارت قرار دیتے تھے اسی طرح اہل کتاب نے بھی اپنے جی سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے لیا تھا اور اب جب کہ اسلام حرام و حلال کے معاملہ میں اس ضابطے کی طرف لوگوں کو لوٹا رہا تھا جو توہمات و بدعات کے بجائے ملتِ ابراہیمؑ کی اساس اور وحی الٰہی کی رہنمائی پر مبنی تھا تو یہ لوگ اس کی تائید کرنے کی جگہ کتاب الٰہی کی باتوں کو چھپاتے تھے۔ اس طرح کی ایک سے زیادہ چیزوں کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے، مثلاً یہود اونٹ کے متعلق دعوے کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے حرام ہے حالانکہ تورات میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا چنانچہ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْھَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تورات لاکر پیش کرو۔ جو اس کے بعد بھی خدا پر جھوٹ باندھیں تو وہی لوگ اصلی ظالم ہیں)

اسی طرح بعض چیزیں یہود پر ان کی سرکشی اور کٹ حجتی کے سبب سے یا ان کے سوال در سوال کی بیماری کے باعث حرام ہو گئی تھیں لیکن اس طرح کی حرمتوں سے متعلق ان کو یہ آگاہی دے دی گئی تھی کہ جب آخری نبی مبعوث ہوں گے تو وہ تمھارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دیں گے اور جو قیدیں اور بندشیں تم پر آج عائد ہیں وہ سب دور ہو جائیں گی۔ لیکن یہود نے اس معاملہ میں بھی حق پوشی اور کفرانِ نعمت کی وہی روش اختیار کی جو ابتدا سے ان کی روش تھی۔ انھوں نے ان چیزوں کی تحلیل کو آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا احسان قرار دینے کے بجائے اس کو دین داری اور تقویٰ کے خلاف قرار دیا اور اس کی آڑ میں قرآن، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب خوب مخالفت کی۔

اس باب میں بعض جرائم نصاریٰ کے بھی بڑے شدید ہیں۔ اگرچہ ان کا جرم تحریم سے زیادہ تحلیل کی نوعیت کا ہے۔ پال نے جو موجودہ مسیحیت کا بانی ہے، یہ فلسفہ پیش کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے احکام غیر بنی اسرائیل پر واجب نہیں ہیں۔ اس طرح اس نے مسیحیوں کے لیے شراب بھی کھلے بندوں جائز کر دی اور خنزیر اور گلا گھونٹے ہوئے جانور کو بھی ان کے لیے مباح کر دیا۔

ان اہل کتاب کے متعلق قرآن نے فرمایا کہ یہ لوگ جو حق پوشی کر رہے ہیں اور اپنی دنیا بنانے کی خاطر دین کو جو بیچ رہے ہیں یہ سودا ان کو بڑا مہنگا پڑے گا۔ دین فروشی کے عوض جو دنیا آتی ہے، یہ آگ ہے جو وہ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں اور اب قیامت کے دن نہ تو خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔

اب ان کے لیے اذیت ناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

بات نہ کرنے کا مطلب ظاہر ہے کہ لطف و عنایت کی بات نہ کرنا ہے۔ گویا فعل کی نفی سے مقصود حقیقی فعل کی نفی ہے۔ دوسری جگہ اس سلسلہ میں وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ کے الفاظ بھی ہیں اس سے بھی مراد نگاہ التفات کی نفی ہے۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ خدا جس قوم کو کتاب و شریعت دیتا ہے اور اپنا پیغام پہنچانے کے لیے اس کے اندر اپنا نبی بھیجتا ہے تو یہ بھی نبی کے واسطہ سے خداوند تعالیٰ گویا اس قوم کو اپنے شرفِ تکلم سے نوازتا ہے۔ پھر خاص طور پر بنی اسرائیل کو تو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پیغمبر کو اپنے خطاب کے شرف سے نوازا۔ اس عظیم عزت افزائی کا تقاضا یہ تھا کہ یہود دل و جان سے خدا کی شریعت اور اس کے کلام کی قدر کرتے اور گوشے گوشے میں اس کا چرچا پھیلاتے لیکن جب انھوں نے اس کو شرف سمجھ کر اس کو پھیلانے کی جگہ اس کو عیب کی طرح چھپانے کی کوشش کی تو اب ان کا کیا منہ رہ گیا ہے کہ خدا ان کو قیامت کے دن پھر اپنے شرفِ خطاب سے نوازے۔

(اہل کتاب پر عتاب)

"اور نہ ان کو پاک کرے گا" یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت اور کتاب کی نعمت سے اسی لیے نوازا تھا کہ ان کو پاکیزہ بنائے لیکن جب انھوں نے اس نعمت کے باوجود گمراہیوں اور آلودگیوں ہی میں لتھڑے رہنا پسند کیا تو اب خدا ان کو آخرت میں پاک نہیں کرے گا۔ آخرت میں پاک نہ کرنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت تزکیہ و تطہیر کا محل نہیں ہے بلکہ جزا و سزا کا محل ہے اس وجہ سے وہاں کسی کے تزکیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی ان بداعمالیوں کے سبب سے چونکہ ان کا ایمان سلب ہو چکا ہے اس وجہ سے ان کو یہ موقع بھی نہیں حاصل ہوگا کہ یہ دوزخ میں اپنے اعمال کی سزا بھگت کر اور پاکیزہ ہو کر جنت میں جا سکیں بلکہ ان کے لیے دائمی عذاب ہوگا اور یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

مسلم شریف کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی آیت کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے زانی، جھوٹے بادشاہ اور گدائے متکبر کو بھی داخل کیا ہے۔ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں بلکہ اشتراکِ علت کی وجہ سے آیت کے حکم کی توسیع ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۱۷۵)

'فَمَا أَصْبَرَ' کا اسلوب مَا أَحْسَنَ کی طرح اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو اس دیدہ دلیری کے ساتھ ہدایت کی جگہ ضلالت اور مغفرت کی جگہ عذاب کو ترجیح دے رہے ہیں تو دوزخ کے معاملہ میں ان کی ڈھٹائی اور جرأت حیرت انگیز ہے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ (۱۷۶)

عتاب کا سبب

یہ اس ناراضگی اور غضب کا سبب بیان ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہُوا ہے۔ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس عتاب کے مستحق اس وجہ سے ٹھہریں گے کہ خدا نے ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے ایک ایسی کتاب اتاری جو تمام جھگڑوں اور سارے اختلافات کو چکا دینے والی ہے لیکن انھوں نے اس کے بعد بھی ہدایت کی جگہ ضلالت ہی کو اختیار کیا تو یہ اسی بات کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیشہ کے لیے خدا کی نظرِ التفات سے محروم ہو کر اس عذاب میں پڑیں جس سے ان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو۔

اس میں بالحقّ[1] کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ خدا نے یہ کتاب قولِ فیصل کے ساتھ اتاری ہے۔ یعنی اہلِ کتاب نے حق پوشی اور تحریف کر کے اللہ کے دین میں جو طرح طرح کے اختلافات پیدا کر دیئے تھے اور جس کے سبب سے یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا کہ کیا حرام ہے کیا حلال، کیا حق ہے اور کیا باطل، اللہ نے قرآن کے ذریعہ سے اس اختلاف و نزاع کو بالکل رفع کر دیا، اب حق کی راہ ہر طالبِ حق کے لیے پھر کھل گئی ہے اور خدا کی شریعت اپنی صحیح اور مکمل شکل میں لوگوں کے سامنے آگئی ہے، اس کے بعد بھی جو لوگ انھی جھگڑوں میں پڑے رہیں تو ان کی شامت اور بدبختی ہی ہے۔

شقاق کے معنی مخالفت اور عناد کے ہیں، چنانچہ فرمایا ہے یَا قَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شِقَاقِیْٓ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ الآیۃ ۸۹۔ ھود (اے میری قوم کے لوگو، میری مخالفت اور دشمنی تمھارے لیے اس بات کا باعث نہ بن جائے کہ تمھارے اوپر بھی اس طرح کا عذاب آدھمکے جس طرح کا عذاب قومِ نوح پر آیا) شقاق کے ساتھ جب بعید کی صفت لگ جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی شخص یا چیز کی مخالفت اور دشمنی میں کوئی شخص اس قدر آگے بڑھ جائے اور اتنی دور نکل جائے کہ اس کو اپنے نفع و نقصان کا بھی کچھ ہوش نہ رہ جائے، اور پھر اس کے لیے اتنی دُور سے پلٹنے اور تلافی مافات کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔ ان اہلِ کتاب کے متعلق فرمایا کہ تورات کے بعد اب قرآن میں بھی انھوں نے یہ جو اختلاف کیا ہے یہ محض ان کی ضد و ضدا کا کرشمہ ہے اور یہ اب اس راہ میں اتنی دور تک نکل گئے ہیں کہ ان کے واپس لوٹنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔

۵۴۔ رخصت اور عزیمت کے معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر

آیت ۱۷۳۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ کی وضاحت کے ضمن میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اس شخص کے لیے کسی حرام سے وقتی طور پر فائدہ اٹھا لینے کی رخصت ہے جس کی بھوک کے سبب سے جان پر آبنی ہو اور زندگی بچانے کی کوئی اور صورت حرام کھا لینے کے سوا اس کو نظر نہ آ رہی ہو۔ قرآن کے الفاظ

---

[1] لفظ حق کے مختلف معانی کی تحقیق آیت ۷۱ کے تحت ملاحظہ ہو۔ یہاں مراد قولِ فیصل ہے۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہیں) اور اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اللہ ایسی حالت میں بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے) صاف بتا رہے ہیں کہ یہ مجبوری کے حالات کے لیے ایک رخصت ہے اسی وجہ سے ہم ان فقہاء کی رائے کے بارے میں متردد ہیں جو اس رخصت کو عزیمت کا درجہ دیتے ہیں اور اس شخص پر خودکشی کا حکم لگاتے ہیں جو اضطرار کی حالت میں حرام سے فائدہ نہ اٹھائے اور اس کے نتیجہ میں اس کی جان چلی جائے۔

ہمارے نزدیک یہ بات اس اجمال کے ساتھ، جیسا کہ ہم آیت کی تاویل کرتے ہوئے ظاہر کر چکے ہیں، صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ رخصت بہرحال رخصت ہے۔ کسی رخصت کو مطلق طور پر عزیمت کا درجہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اضطرار کے باوجود حرام سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی موت حرام کی موت ہوئی۔

اس امر میں تو شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں جو رخصتیں رکھی ہیں وہ سب اس کی مہربانی اور رحمت کا مظہر ہیں۔ وہ ہماری کمزوریوں اور ہماری مجبوریوں سے سب سے زیادہ باخبر ہے۔ اس وجہ سے اس نے ہم پر کوئی بوجھ ایسا نہیں ڈالا ہے جو ہماری طاقت سے زیادہ ہو۔ اس نے وضو کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ اجازت بھی دے دی کہ اگر سفر کی حالت ہو، پانی نہ دستیاب ہو سکتا ہو یا بیماری کے سبب سے وضو کرنے میں مضرت کا اندیشہ ہو تو آدمی تیمم کر سکتا ہے۔ اس نے نماز کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ رخصت بھی عنایت فرمائی کہ سفر کی حالت میں آدمی قصر کر سکتا ہے۔ اسی طرح روزہ کا حکم دیا تو یہ اجازت بھی دی کہ اگر روزے کے مہینہ میں سفر پیش آجائے یا آدمی بیمار پڑ جائے تو دوسرے دنوں میں اپنے روزے پورے کرے۔ اس طرح کی رخصتیں دین کے ان تمام احکام کے ساتھ مذکور ہیں جن کی تعمیل کے کسی مرحلہ میں کوئی ایسی مشکل پیش آ سکتی ہے جو عام قوتِ برداشت سے زیادہ ہو۔ ان کے بارے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ آدمی ضرورت پیش آ جانے پر ان سے فائدہ اٹھائے اور عزیمت کے جوش میں خواہ مخواہ اپنی جان کو مشقت میں نہ ڈالے۔ اگر کوئی شخص مضرت کے اندیشہ کے باوجود تیمم کے بجائے وضو پر اصرار کرے یا زحمتوں کے باوجود سفر میں اتمامِ نماز ہی کو تقاضائے تقویٰ سمجھے یا مشقت کے باوجود سفر کی حالت میں بھی روزے پورے کرنے ہی کو عزیمت جانے تو ہمارے نزدیک ایسا شخص اسلام کا اصلی مزاج سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ یہ دین کے معاملہ میں تشدد پسندی ہے اور جو شخص دین میں تشدد پسندی کی راہ اختیار کرتا ہے اور رخصتوں کو خلافِ عزیمت جانتا ہے وہ درحقیقت دین سے دھینگا مشتی کرتا ہے اور ایسا شخص حدیث میں وارد ہے کہ دین سے شکست کھا جاتا ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو تنبیہ فرمائی جو سفر میں روزے کی وجہ سے اپنے آپ کو سخت مشقت میں ڈالے ہوئے تھے لیکن اگر کسی شخص کو سفر میں ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہوں وہ بلا کسی خاص زحمت کے پوری نمازیں پڑھ سکتا ہے یا روزے رکھ سکتا ہے تو اس سے کسی گناہ کے لازم ہونے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟

اسی طرح اگر کسی شخص کو حالتِ اضطرار پیش آجائے اور جان بچانے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر باقی ہی نہ رہ جائے کہ وہ کسی حرام سے فائدہ اٹھائے تو عام حالات میں اسلام کا مزاج یہی تقاضا کرتا ہے کہ جان بچانے کی حد تک وہ اس حرام سے فائدہ اٹھالے۔ اس چیز کو نہ خلاف تقویٰ خیال کرے نہ خلافِ عزیمت لیکن بعض شکلیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جب ایک غیرت مند مسلمان کے شایانِ شان بات یہی ہوتی ہے کہ وہ جان تو دے دے لیکن حرام کو ہاتھ لگانا گوارا نہ کرے۔ مثلاً اگر کسی جگہ فساق و فجار کے صاحبِ اختیار ہونے کی وجہ سے حرام و حلال کی تمیز اٹھ گئی ہو اور آدمی کو کوئی حرام چیز کھانے پر مجبور کیا جائے تو اس کے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ عزیمت کی راہ اختیار کرے اور دوسروں کے ایمان کو زندہ کرنے کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے۔ یہ بازی کھیل کر وہ گنہگار نہیں ہو گا بلکہ انشاء اللہ اپنی غیرت ایمانی اور احترام حقوق شریعت الٰہی کے صلے میں شہادت کا مقام حاصل کرے گا۔ کم از کم علماء و مصلحین کے لیے تو ایسے حالات کے اندر یہی روش بہتر ہے۔ حضرات صحابہؓ نے مکہ کی ابتدائی زندگی میں جو تکلیفیں کلمۂ توحید کی خاطر اٹھائی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں؟ کتنے اصحاب نے اعدائے توحید کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا اور زندگی تو سب ہی حضرات کی خطرے میں رہی لیکن ان میں سے کسی ایک صحابیؓ کے متعلق بھی ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ انھوں نے جان بچانے کی خاطر کلمہ کفر زبان سے نکالا ہو حالانکہ قرآن میں اس بات کی صریح اجازت موجود تھی کہ اکراہ کی صورت میں آدمی جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ سکتا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہُوا کہ نہ تو دین کی رخصتوں کو حقیر سمجھنے کا رجحان صحیح ہے اور نہ رخصتوں ہی کو عزیمت قرار دے دینے کا رجحان صحیح ہے بلکہ صحیح مسلک یہ ہے کہ عام حالات میں جس طرح رخصتوں سے فائدہ اٹھانا مزاج شریعت کے مطابق ہے اسی طرح خاص حالات میں عزیمت کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی دین کا مطالبہ ہے۔

۵۵۔ آگے کا مضمون ——— آیت ۱۷۷

دین محض چند رسوم ظواہر کا نام نہیں

اوپر والے مجموعہ آیات میں، جیسا کہ واضح ہُوا، توحید کا بیان تھا۔ اب آگے والی آیت میں اس کے لوازم و ثمرات یعنی ایمان، انفاق، اقامتِ صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، ایفائے عہد اور ہر طرح کے حالات میں حق پر استقامت کا بیان ہو رہا ہے۔ اس مضمون کی تمہید اس طرح ہے کہ خدا کے ساتھ وفاداری کا حق مشرق یا مغرب کی طرف رخ کر لینے سے ادا نہیں ہو گا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے سمجھ رکھا ہے، چنانچہ اسی مسئلہ پر ان کے ہاں ایک مدت سے معرکۂ جدال و قتال گرم ہے۔ گویا ان کے خیال میں اصل دین یہی ہے۔ بلکہ اس کے لیے فلاں فلاں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس تمہید سے مقصود مسلمانوں کو یہ آگاہی دینا ہے کہ دین محض چند رسوم و ظواہر کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی سے نہایت گہرے تعلق رکھنے والے اعمال و اخلاق کا مجموعہ ہے اس وجہ سے وہ اگلی امتوں کی طرح صرف رسوم کے بندے بن کر نہ رہ جائیں بلکہ دین کی اصلی حقیقتوں کو اپنائیں جو یہ ہیں۔ انہی کو اپنا کر وہ خدا

کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق ادا کر سکیں گے۔ ان کے بغیر محبت و وفاداری کے دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔ اس روشنی میں آیت کی تلاوت فرمائیے ارشاد ہوتا ہے۔

آیت ۱۷۷

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ آیت ۱۷۷

خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کر لو بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدق دل سے ایمان لائیں۔ اور اپنے مال، اس کی محبت کے باوجود، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں، خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیف جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔

۵۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

بِرّ کے معنی

'بِرّ' کا اصل مفہوم عربی لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے۔ عام اس سے کہ خدا کا حق ہو، ماں باپ کا حق ہو، یا اللہ کے بندوں کا حق ہو۔ ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں

شامل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف وولا، عقود اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اسی وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں۔ بَرٌّ اور بَارٌّ اس سے صفت کے صیغے ہیں۔ بَرٌّ بِوَالِدَیْہِ اس سعادت مند بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے والا ہو۔ بَرَّ بِالْقَسَمِ کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کر دی۔[1] اللہ تعالیٰ کے لیے بھی بَرّ کی صفت استعمال ہوئی ہے اس لیے کہ اس نے بندوں کے جو حقوق اپنے اوپر لیے ہیں یا جو وعدے ان سے کیے ہیں وہ ان کو ایک ایک کر کے دنیا اور آخرت دونوں جگہ پورے کرنے والا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حقوق و واجبات ہوں یا نیکیاں اور بھلائیاں سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے ہمیں ترجمہ کے لیے اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر دے۔ ہم نے جو لفظ اختیار کیا ہے وہ ہمارے نزدیک ایک حد تک لفظ کی اصل روح کو ادا کرتا ہے۔

یہاں اصل بیان تو ایمان و انفاق اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کا ہے لیکن جیسا کہ اس باب کی تمہید میں ہم بیان کر آئے ہیں، ان احکام و شرائع کے پہلو بہ پہلو تجدیدِ دین کے تقاضوں کے تحت ان بدعات کی تردید بھی ہے جو اہل کتاب یا مشرکین نے شریعتِ الٰہی میں داخل کر دی تھیں اور جن کے سبب سے پوری شریعت یا تو مسخ ہو کر رہ گئی تھی یا صرف چند ظواہر اور رسوم کا مجموعہ بن گئی تھی۔ یہاں اسی تجدیدِ دین کے تقاضے کے تحت اصل احکام کے بیان کی تمہید اس طرح اٹھائی کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کا حق صرف مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینے سے ادا نہیں ہو جاتا بلکہ اصل شے وہ اعمال و اخلاق ہیں جن کی شریعت نے تعلیم دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے جن کے ہاں تورات و انجیل کی اصل تعلیمات تو طاقِ نسیان پر رکھ دی گئی تھیں لیکن قبلہ کے معاملہ میں مشرق و مغرب کا جھگڑا، جیسا کہ آیات ۱۱۵، ۱۴۲ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، ان کے درمیان اس طرح اٹھ کھڑا ہوا تھا گویا سارے دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے۔

اس امت کے لیے ایک تنبیہ

یہ تمہید جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے اس امت کے لیے تنبیہ ہے کہ اس طرح کی فروعی باتوں میں الجھ کر اصل دین سے دستبردار نہ ہو جانا ورنہ یہود و نصاریٰ ہی کی طرح تم بھی مچھر کو چھاننے والے اور اونٹ کے نگلنے والے بن کر رہ جاؤ گے اور جس طرح ان کا دعوائے خدا پرستی بے معنی ثابت ہوا اسی طرح تمہاری خدا پرستی بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ ٹھیک اسی مفہوم کی تنبیہ آگے حج کے بیان کے سلسلہ میں بھی فرمائی ہے۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۱۸۹- بقرہ (یہ کوئی تقویٰ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو، تقویٰ تو اس کا ہے جو حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھے) ان تمام تنبیہات

---

[1] لفظ بِرّ کی یہ تحقیق زیادہ تر مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔

سے مقصود، جیسا کہ عرض کیا گیا، اس امت کو یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی بدعات اور ظاہر پرستیوں سے بچا کر دین کی اصل حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ امت بھی انھیں وادیوں میں بھٹک کر رہ گئی جن میں پچھلی امتیں ہلاک ہوئی تھیں۔

"وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ" میں ایک مضاف عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق محذوف ہے گویا پوری عبارت یوں ہوگی وَلٰکِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ. مضاف کے حذف کی مثال خود اسی زیر بحث آیت میں موجود ہے۔ فرمایا ہے۔ وَفِی الرِّقَابِ. ظاہر ہے کہ یہ وَفِیْ فَکِّ الرِّقَابِ ہے۔

ایمان اور اس کے اجزاء

ایمان سے یہاں، سیاق و سباق دلیل ہے کہ حقیقی ایمان مراد ہے۔ اس لیے کہ حقیقی ایمان ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی خدا کی وفاداری کا حق ادا کر سکتا ہے۔ حقیقی ایمان اللہ پر یہ ہے کہ آدمی بلا کسی شائبہ شرک کے اپنے کو پورا پورا اپنے رب کے حوالہ کر دے۔ آخرت پر حقیقی ایمان یہ ہے کہ آدمی مرنے کے بعد اٹھائے جانے کو تسلیم کرے، اپنے ہر قول و فعل کا خدا کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھے اور جھوٹی شفاعتوں کے وہم میں مبتلا نہ ہو۔ فرشتوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ہستی کو تسلیم کرے، ان کو معصوم اور قدسی صفت جانے، ان کو اللہ کی ہدایت لانے والا، امین اور معتمد مانے اور ان کو قضا و قدر کے فیصلوں کی تنفیذ کا ذریعہ سمجھے۔ ایمان بالکتاب کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اللہ کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت مانے، اس کو حق و باطل کی کسوٹی سمجھے اور زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہنمائی پر پورا پورا اعتماد کرے۔ نبیوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کو خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی مانے، ان کے علم کو بے خطا سمجھے، ان کے عمل کو زندگی کے لیے اسوہ قرار دے اور ان کی اطاعت، اتباع اور محبت کو لازم جانے۔

ایمان بالملائکہ

یہاں ایک بات ممکن ہے بعض ذہنوں میں کچھ کھٹکے۔ وہ یہ کہ ایمان کے اجزا میں فرشتوں پر ایمان کو کیوں داخل کر دیا ہے جب کہ ان کا تجربہ صرف نبیوں ہی کو ہوا ہے اور ان پر ایمان لانے کا کوئی خاص علمی یا عملی فائدہ ایک عام آدمی پر واضح نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کا حق آخرت، کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے بغیر ادا نہیں ہوتا، انھی چیزوں پر ایمان لانے سے ایمان باللہ ہماری زندگی کی ایک محسوس، مؤثر اور فعال حقیقت بنتا ہے اسی طرح ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسل کا ایک غیر منفک جزو ایمان بالملئکہ ہے۔ ملائکہ کو مانے بغیر خدا اور اس کے نبیوں کے درمیان کا واسطہ غیر واضح اور غیر معین رہ جاتا ہے، جس کے غیر واضح رہنے سے نہ صرف سلسلۂ علم و ہدایت کی ایک نہایت اہم کڑی گم شدہ رہ جاتی ہے بلکہ ہدایت آسمانی کے باب میں عقل انسانی کو گمراہی کی بہت سی راہیں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ بات تو دنیا ہمیشہ سے مانتی آئی ہے کہ خدا ہے اور یہ بات بھی اس نے ہمیشہ محسوس کی ہے کہ جب وہ ہے تو اسے اپنی مرضیات سے اپنے بندوں کو آگاہ بھی کرنا چاہیے لیکن جب وہ کبھی بے نقاب اور رو در رو ہو کر ہمارے سامنے نہیں آتا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ذریعہ اور واسطہ کیا ہے جس سے وہ خلق کو

اپنے احکام وہدایات سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر اس مقصد کے لیے اس نے اپنے خاص خاص بندوں کو منتخب کیا ہے، جن کو انبیاء و رسل کہتے ہیں تو بعینہٖ یہی سوال ان کے بارے میں بھی اٹھتا ہے کہ ان نبیوں اور رسولوں کو وہ اپنے علم وہدایت سے آگاہ کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کرتا ہے۔ کیا رو در رو ہو کر خود ان سے بات کرتا ہے یا کوئی اور ذریعہ اختیار فرماتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے درمیان علم کا واسطہ وحی ہے جو وہ اپنے فرشتوں بالخصوص اپنے مقرب فرشتے جبریلؑ کے ذریعہ سے بھیجتا ہے یہ فرشتے خدا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اور برتر مخلوق ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ یہ براہ راست خدا سے وحی اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ خدا کے احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرتے ہیں اور چونکہ خدا کے حکم واختیار کے تحت اور اس کی نگرانی میں کرتے ہیں اس وجہ سے نہ تو کوئی اور مخلوق ان کے کسی کام میں رکاوٹ ڈال سکتی اور نہ وہ خود ہی اس میں کبھی بھول چوک یا کسی غلطی کے مرتکب ہو سکتے۔ انہی کے زمرہ کی ایک مقرب ہستی حضرت جبریلؑ ہیں جو خدا کے ہاں سب سے زیادہ بلند مرتبہ اور مقرب ہیں۔ قرآن میں ان کی صفت ذی قوت، مطاع اور امین بھی آئی ہے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے وہ اس کے لیے تمام صلاحیتوں اور قوتوں سے بھرپور ہیں، دوسری قوتیں یا ارواح خبیثہ ان کو متاثر یا مغلوب نہیں کر سکتیں۔ ان کے دائرہ کار میں سب بے چون وچرا ان کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ کوئی ان کے حکم سے سرتابی کر سکے، وحی الٰہی کی جو امانت نبیوں اور رسولوں تک پہنچانے کے لیے ان کے سپرد کی جاتی ہے وہ اس کو بے کم وکاست پہنچاتے ہیں، ممکن نہیں کہ اس میں کسی زیر زبر کا بھی فرق ہو سکے۔

وحی و رسالت کے ساتھ فرشتوں کے اس گہرے تعلق کی وجہ سے نبیوں اور کتابوں پر ایمان لانے کے لیے ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوا۔ یہ خدا اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے درمیان رسالت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ ناگزیر ہیں کہ یہی ایک ایسی مخلوق ہیں جو عالمِ لاہوت اور عالمِ ناسوت دونوں کے ساتھ یکساں ربط رکھ سکتے ہیں، یہ اپنی نورانیت کی وجہ سے خدا کے انوار و تجلیات کے بھی متحمل ہو سکتے ہیں اور اپنی مخلوقیت کے پہلو سے انسانوں سے بھی اتصال پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کے سوا کوئی اور مخلوق خدا تک رسائی کا یہ درجہ اور مقام نہیں رکھتی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ان رسولوں پر بھی ایمان لایا جائے جو خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان رسالت کا واسطہ ہیں۔

یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ عقل انسانی عالم لاہوت سے تعلق رکھنے والی ارواح کے تجسس میں ہمیشہ سے رہی ہے اور اس ضرورت کو اس نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اس تلاش میں اگر اس کو کوئی صحیح چیز نہیں مل سکی ہے تو جو غلط سے غلط چیز بھی اس کے ہاتھ آ گئی ہے اسی کا دامن اس نے پکڑ لیا ہے۔ عرب کے کاہن و ساحر جنات، شیاطین اور ہاتف غیبی کو عالم لاہوت سے تعلق کا ذریعہ سمجھتے تھے، ہندوستان کے جوتشی اور منجم ستاروں کی گردشوں کے اندر غیب کے اسرار ڈھونڈھتے تھے۔ چین کے مندروں کے پجاری اپنے

باپ دادا کی ارواح کے توسط سے عالم غیب سے توسل پیدا کرتے تھے۔ قرآن نے ان تمام غلط وسائل اور واسطوں کی نفی کردی اور ان کے ذریعہ سے حاصل شدہ علم کو رطب و یابس کا مجموعہ ٹھہرایا اور ساتھ ہی یہ حقیقت واضح فرمائی کہ علم الٰہی کا قابل اعتماد ذریعہ صرف ملائکہ ہیں جو انبیاء کے پاس آتے ہیں اور جتنا کچھ خدا ان کو دیتا ہے وہ بے کم و کاست ان کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ایمان بالملٰئکہ، ایمان بالکتاب، اور ایمان بالانبیاء سب ایک دوسرے سے اتصال رکھنے والی کڑیاں ہیں اور جس طرح ایمان بالکتب اور ایمان بالانبیاء ہماری زندگی کی نہایت محسوس حقیقتیں ہیں اسی طرح ایمان بالملٰئکہ بھی ہماری زندگی کی ایک نہایت اہم علمی و عملی حقیقت ہے۔

’علیٰ حُبِّہٖ‘ میں ضمیر کا مرجع

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ۔ میں ضمیر مجرور یوں تو خدا کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے یعنی آدمی اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں خرچ کرے لیکن ہمارے نزدیک مختلف وجوہ سے ان لوگوں کا قول قابل ترجیح ہے جو اس کا مرجع مال کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی آدمی مال کی محبت کے باوجود اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے۔

مال کی محبت کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مال بجائے خود قیمتی اور دل پسند ہو، دوسرا یہ کہ آدمی خود اس کا ایسا ضرورت مند ہو کہ دوسرے کے لیے ایثار کرنا نفس پر شاق ہو رہا ہو۔ تیسرا یہ کہ زمانہ قحط اور گرانی کا ہو جس میں کشادہ دست آدمی بھی محتاط اور کفایت پسند بن جایا کرتا ہے۔ عَلٰی حُبِّہٖ کا لفظ ان تینوں ہی صورتوں پر حاوی ہے۔ اس مفہوم کو ترجیح دینے کی ہمارے نزدیک کئی وجہیں ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بِرّ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و وفاداری کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے کے لیے انسان کو کس قسم کا انفاق کرنا چاہیے۔ یہ مضمون دوسرے مقامات میں جہاں جہاں بیان ہوا ہے وہاں صراحت کے ساتھ یہ بات بتائی گئی ہے کہ یہ مرتبہ اس مال کے خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو محبوب ہو، مثلاً لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۹۲-آل عمران (تم کامل وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک اس مال میں سے خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے) اسی طرح دوسرے مقام میں سچے اہل ایمان کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۹-حشر (اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو)

دوسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ سب سے افضل صدقہ کون سا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ جو ایک بے مایہ اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنے کسی ایسے عزیز پر خرچ کرتا ہے جو اس کے خلاف اپنے دل میں عداوت رکھتا ہے۔

تیسری یہ کہ اہل عرب کے ہاں بھی سب سے زیادہ قابل تعریف فیاضی انھی لوگوں کی سمجھی جاتی تھی جو زمانۂ قحط و گرانی میں فیاضی کرتے تھے جب کہ مال، مالداروں کی نظر میں بھی بڑی محبوب چیز بن جاتا ہے۔ عرب شعرا نے اس صفت کی بالاتفاق تعریف کی ہے۔ دوسری قوموں میں بھی یہ صفت بلا اختلاف ممدوح ہے۔

چوتھی یہ کہ اس طرح کا انفاق اغلب یہی ہے کہ خدا کی محبت میں ہو، اس لیے کہ بغیر اس قوی محرک کے نفس کا اس قسم کے ایثار پر آمادہ ہونا بڑا مشکل ہے۔ اس پہلو سے یہ مفہوم پہلے مفہوم پر خود بخود حاوی ہو جاتا ہے۔

انفاق کے مصارف

انفاق کے مصارف میں سب سے پہلے قرابت مندوں کو رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے اعزاء واقربا اگر وہ ضرورت مند ہیں، اس کی اعانت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ دل میں عداوت بھی چھپائے ہوئے ہوں جب بھی سب سے افضل انفاق، جیسا کہ اوپر والی حدیث سے واضح ہوا، وہی ہے جو ان کے لیے کیا جائے۔

قرابت مندوں کے بعد معاً یتامیٰ کا ذکر اسلامی معاشرہ میں ان کے درجہ و مرتبہ کو واضح کرتا ہے کہ اپنے عزیزوں کے بعد پہلی نظر آدمی کی ان بچوں پر پڑنی چاہیے جو سایۂ پدری سے محروم ہو چکے ہیں اور جن کی کفالت و تربیت کی ساری ذمہ داری معاشرہ پر منتقل ہو چکی ہے۔

اِبْنُ السَّبِيْل سے مراد مسافر ہے۔ مسافر مجرد اپنی مسافرت کی حالت کی بنا پر مستحق اعانت ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ صاحب استطاعت ہے یا غیر صاحبِ استطاعت اگر مستحق اعانت ہونے کے لیے غیر صاحبِ استطاعت ہونے کی شرط ہوتی تو مسکین کے بعد اس کے علیٰحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سائلین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اعانت کے لیے سوال کر بیٹھیں۔ مساکین کے بعد ان کے مستقل ذکر کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو شخص سوال کر بیٹھے اس کے متعلق زیادہ کھوج کرید کی ضرورت نہیں ہے کہ واقعی وہ محتاج ہے یا نہیں۔ اگر وہ بے ضرورت سوال کر رہا ہے تو اس کی جواب دہی خود اس کے اوپر اللہ کے ہاں ہے ہمارا حق صرف یہ ہے کہ اگر ہم امداد کر سکتے ہوں تو ایسے شخص کی امداد کریں اور اگر معذور ہوں تو، جیسا کہ قرآن اور حدیث میں ہدایت ہے، شائستہ انداز سے اس کے سامنے اپنی معذرت پیش کر دیں۔

وَفِي الرِّقَابِ میں رقاب رقبہ کی جمع ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی فِي فَكِّ الرِّقَابِ گردنوں سے مراد یہاں غلاموں کی گردنیں ہیں۔ ان کو طوقِ غلامی سے چھڑانا اور آزاد انسانوں کی سطح پر لانا انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے اس وجہ سے اسلام نے اپنی مدّاتِ خیر میں ان کو بھی شامل کر لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کا معاملہ اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو نہیں تھا، وقت کے بین الاقوامی قانونِ جنگ کے تحت اسلام نے اس کو محض وقتی طور پر اس لیے گوارا کیا تھا کہ اس وقت بین الاقوامی سطح پر جنگ کے قیدیوں کے مسئلہ کا کوئی اور حل موجود نہیں تھا۔ لیکن اس کو گوارا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام نے اپنے ماحول میں غلاموں کی آزادی کی مختلف نوعیتوں سے حوصلہ افزائی کی۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کو خرید کر آزاد کر دینے یا ان کی مکاتبت یعنی شرطِ آزادی کی رقم ادا کرنے کو ایک ثواب کا کام ٹھہرا دیا۔

اب اس زمانہ میں غلامی اگرچہ قانوناً ختم ہو چکی ہے اور یہ بات عین منشائے اسلام کے مطابق ہوئی ہے لیکن عملاً آج بھی بے شمار انسان اپنی معاشی مجبوریوں اور خاص طور پر سودی قرضوں کی لعنت کے سبب سے ایسے بندھنوں میں گرفتار یا جیلوں میں بند ہیں کہ ان کو اگر غلام نہیں تو غلاموں سے مشابہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی گلو خلاصی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور کھیتوں کو چھڑانا بھی انشاء اللہ فَکُّ رَقَبَۃٍ ہی کے درجے کی نیکی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ

اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ۔ پر مفصل بحث اس کتاب کے شروع میں ہو چکی ہے۔ یہاں ایمان و انفاق کے ذکر کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ان دونوں کے قانونی و عملی مظاہر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ایمان کی عظیم حقیقت کا مظہر عملی نماز ہے اور انفاق کی وسیع حقیقت کا مظہر قانونی زکوٰۃ۔ مطلب ان دونوں کے ذکر سے یہ ہے کہ ایمان اور انفاق کی شہادت دینے کے لیے کم سے کم جو چیز مطلوب ہے وہ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں غائب ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ ایمان باقی رہا نہ انفاق در آنحالیکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے بندہ خالق اور خلق کے ساتھ اپنے تعلق کو صحت مندانہ بنیاد پر قائم کرتا ہے۔

یہاں زکوٰۃ کا علیحدہ ذکر کرنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اوپر جس انفاق کا ذکر ہے وہ اس قانونی مطالبہ سے الگ چیز ہے۔ بر و تقویٰ کا درجہ صرف ادائے زکوٰۃ سے نہیں بلکہ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً فیاضانہ خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلوب کا ردّ و بدل

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں) میں دفعتہً اسلوب کلام بدل گیا ہے۔ اوپر ایمان، انفاق، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا تھا۔ اَلْمُوْفُوْنَ کا عطف تو انھی پر ہے لیکن یہ اسم فاعل اور صفت کی صورت میں ہے۔ پھر آگے الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ (اور ثابت قدم رہنے والے) آ رہا ہے جو ہے تو صفت کی صورت میں لیکن مُوْفُوْنَ پر معطوف ہونے کے باوجود صَابِرُوْنَ کے بجائے صَابِرِیْنَ یعنی حالتِ نصب میں ہو گیا ہے۔

اسلوب کا یہ ردّ و بدل صرف تنوع کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ معنوی فوائد بھی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

عربی زبان کے طلبہ اس بات سے واقف ہیں کہ عربی میں فعل کے صیغے تو صرف کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں لیکن صفت کے صیغے کسی مستقل صفت کسی خصلت اور کسی کردار کو ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے اندر ایک عزم و جزم کی روح بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ سلسلۂ کلام میں اگر کسی صفت کا ذکر بغیر کسی ظاہری سبب کے حالتِ نصب میں ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ متکلم اس پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہے۔ ہمارے اہلِ نحو اس بات کو عَلٰی سَبِیْلِ الْمَدْحِ یا عَلٰی سَبِیْلِ الْاِخْتِصَاصِ کی اصطلاح میں تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہاں مُوْفُوْنَ کے بعد دفعتہً اس سے بالکل مختلف اسلوب میں الصّٰبِرِیْنَ جو آ گیا تو اس سے

معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ گویا متکلم یہ کہنا چاہتا ہے کہ اَنَا اَخُصُّ بِالذِّکْرِ الصَّابِرِیْنَ میں صابرین کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔

اسلوب کی اس وضاحت کے بعد اب یہ سوال ذہن میں پیدا ہوگا کہ اوپر عقائد اور عبادات کا ذکر تو سیدھے سادے فعل کے صیغوں سے کیا، پھر یہ ایفائے عہد اور صبر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کا ذکر اسلوب بدل بدل کر اس اہتمام و اختصاص اور اس تاکید و تنبیہہ کے ساتھ فرمایا؟ اس کے جواب میں چند باتیں پیش نظر رکھیے۔

دین میں سیرت و کردار کی اہمیت

ایک تو یہ کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق سیرت و کردار سے ہے، سیرت و کردار کا معاملہ بڑے عزم و جزم اور ریاضت و تربیت کا محتاج ہوتا ہے۔ جہاں تک ظاہری عقائد و عبادات کا تعلق ہے ان کو نبھانے والے تو دین کے زوال و انحطاط کے بعد بھی بہت سے نکل آتے ہیں لیکن کردار جو مغز دین اور روح دین ہے اس کا اہتمام بڑے بڑوں کے اندر بھی نہیں پایا جاتا۔ اہل مذاہب میں یہ کمزوری بہت نمایاں رہی ہے کہ انھوں نے عقائد و عبادات کے ظواہر پر تو بڑے بڑے معرکے اٹھائے ہیں لیکن کردار کی تعمیر پر انھوں نے بہت کم توجہ کی ہے یہاں چونکہ اس آخری امت کی رہنمائی مقام بر و اطاعت کی طرف کی جا رہی ہے اس وجہ سے کردار کے پہلو پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ یہ مقام بغیر اعلیٰ کردار کے جس میں ایفائے عہد اور صبر کو اولین اہمیت ہے، حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسری یہ کہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمام عقائد و عبادات سے اصل مقصود اعلیٰ سیرت و کردار کی تعمیر ہی ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور نماز روزے کے اہتمام سے مقصود صرف چند باتوں کو مان لینا یا چند رسوم کو بجا لانا ہی تو نہیں ہے۔ ان کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ اللہ و رسول پر ایمان لانے سے انسان کے اندر جو روشنی پیدا ہوتی ہے اس سے ہمارے دل جگمگا اٹھیں اور نماز روزے سے جو مضبوط انفرادی و اجتماعی کردار پیدا ہوتا ہے وہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کی خصوصیت بن جائے۔ یہ نہ ہو تو تمام عقائد و عبادات سمجھیے کہ بالکل بے جان و بے روح ہیں۔ یہی نکتہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ عقائد و عبادات کے پہلو بہ پہلو ان کے عملی اثرات کی طرف ضرور توجہ دلائی ہے تاکہ ان سے غفلت نہ ہونے پائے۔

تیسری یہ کہ امتحان و آزمائش کا اصلی میدان سیرت و کردار ہی کا میدان ہے۔ انسان کا اصلی خزانہ جو وہ دین کی مدد سے فراہم کرتا ہے یا کر سکتا ہے مضبوط اور پاکیزہ سیرت ہی ہے۔ یہی چیز اس کو انفرادی زندگی میں بھی مقام بر و تقویٰ پر سرفراز کرتی ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی اس کے لیے ابرار و صالحین اور شہداء و صدیقین کی معیت کی ضامن بنتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس پر خاص طور پر زور دیا جائے کہ مسلمان ہر قسم کی آزمائشوں اور ہر طرح کے فتنوں میں اپنے اس خزانہ کی حفاظت کے لیے چوکنا رہے۔

صبر اور ایفائے عہد

ایک سوال یہاں اور بھی پیدا ہو سکتا ہے وہ یہ کہ یہاں سیرت و کردار سے متعلق صرف دو ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ ایک ایفائے عہد کا، دوسری صبر کا۔ اس فہرست میں اور بھی چیزیں شامل ہو سکتی تھیں، آخر ان کا ذکر

۵۷- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۷۸-۱۷۹

قیامِ امن و عدل کی دو بنیادیں

برّ و تقویٰ کی اصلی حقیقت واضح کرنے کے بعد ان معاملات کی طرف توجہ فرمائی جو اسی برّ و تقویٰ پر مبنی ہیں اور جن کی اس اعتبار سے بڑی اہمیت ہے کہ انھی پر معاشرہ کے امن و عدل اور اس کے تحفظ و بقا کا انحصار ہے۔ اگر ایک متوسط درجہ کا ذہن رکھنے والا آدمی بھی غور کرے گا تو وہ نہایت آسانی سے اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے کہ انسانوں اور انسانوں کے تعلقات کی استواری کی بنیاد اصلاً دو چیزوں پر ہے۔ ایک اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کی جان کا احترام کرے۔ دوسرے اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کے مال کا احترام کرے۔ اسی وجہ سے حرمتِ جان اور حرمتِ مال کے قانون کو ہمیشہ سے دوسرے تمام قوانین پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اسی اصل کے تحت، جو تمام تر فطرتِ انسانی پر مبنی ہے، قرآن نے بھی برّ اور تقویٰ کی بنیاد استوار کرنے کے بعد سب سے پہلے احترامِ جان کے قانون کو لیا اور قصاص کو پورے معاشرے کی ذمہ داری قرار دیا۔ یعنی اگر کوئی شخص قتل ہو گیا ہے تو یہ صرف اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس کے قاتل کا کھوج لگائیں اور اس کو سزا دیں بلکہ پورے معاشرے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا تعاقب کرے اور اس کو کیفرِ کردار کو پہنچائے۔ گویا ایک شخص کا قتل ہونا سب کا قتل ہونا اور اس کا زندہ ہونا سب کا زندہ ہونا ہے۔

قصاص کا یہ قانون موجود تو اہلِ کتاب کے ہاں بھی تھا اور اہلِ عرب کے ہاں بھی۔ مگر انھوں نے جس طرح ہر قانون کی روح کچل کے رکھ دی تھی اسی طرح اس قانون کی روح بھی ختم کر دی تھی۔ اس قانون کی اصل روح بے لاگ انصاف اور کامل مساوات ہے۔ یعنی اس معاملے میں ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، شریف و وضیع اور آقا و غلام سب ایک ہی سطح پر رکھے جائیں اور قانون اور عدالت، ہر ایک کے ساتھ بالکل یکساں معاملہ کریں۔ لیکن یہ بات نہ اہلِ کتاب کے یہاں باقی رہ گئی تھی نہ اہلِ عرب کے یہاں بلکہ یہ کہنا بھی شاید بے جا نہیں ہے کہ آج بھی تہذیب و تمدن کی اس ترقی کے باوجود، دنیا کے کسی ملک اور کسی قانون میں بھی احترامِ جان اور مساوات کا یہ تصور نہیں پایا جاتا جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۷۸-۱۷۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى

کیوں نہیں فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں درحقیقت سیرت و اخلاق سے متعلق تمام اجزا کے لیے بمنزلہ شیرازہ ہیں۔ ایفائے عہد کے اندر تمام چھوٹے بڑے حقوق و فرائض آجاتے ہیں خواہ وہ خلق سے متعلق ہوں یا خالق سے، خواہ وہ کسی تحریری معاہدہ سے وجود میں آتے ہوں یا کسی نسبت، تعلق، رشتہ داری اور قرابت سے، خواہ ان کا اظہار و اعلان ہوتا ہو یا وہ ہر اچھی سوسائٹی میں بغیر کہے ہوئے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ اللہ اور رسول، ماں اور باپ، بیوی اور بچے، خویش و اقارب، کنبہ اور خاندان، پڑوسی اور اہل محلہ، استاذ اور شاگرد، نوکر اور آقا، ملک اور قوم، ہر ایک کے ساتھ ہم کسی نہ کسی ظاہری یا مخفی معاہدہ کے تحت بندھے ہوئے ہیں اور یہ بِرّ و تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے کہ ان تمام معاہدوں کے حقوق ادا کرنے والے بنیں۔ گویا ایفائے عہد کی اصل روح ایفائے حقوق ہے اور ایفائے حقوق انسان کے تمام چھوٹے بڑے فرائض کو محیط ہے۔

اس کے ساتھ صبر کی صفت کو جمع کر کے یہ واضح فرما دیا کہ ہر وہ مزاحمت جو ایفائے حقوق کی اس راہ میں حائل ہو مومن عزیمت و استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے اور کسی حال میں بھی طمع، پست ہمتی یا خوف سے مغلوب نہ ہو۔

صبر کے تین مواقع کا حوالہ دیا ہے۔ ایک بَأْسَآءِ کا جس سے فقر و فاقہ کی تکالیف مراد ہیں۔ دوسرے ضَرَّاء کا جس سے تکالیف جسمانی کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرے بَأْس کا جس سے جنگ کے حالات مراد ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا عزم انھی تین راہوں سے آزمائش میں پڑ سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان تینوں حالتوں کے اندر موقف حق پر ثابت قدم رہنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے بِرّ و تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوائے وفاداری میں سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی ہیں) اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ جو لوگ محض چند خالی خولی ظاہرداریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا کرتے ہیں وہ نہ تو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں، نہ متقی ہیں۔

ایک نکتہ یہاں اور بھی ملحوظ رہے وہ یہ کہ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ کے ساتھ إِذَا عَاهَدُوا کی جو قید لگی ہوئی ہے اس سے بھی اس عزم و استقلال کا اظہار ہو رہا ہے جو ان وفا پرستوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو خواہ کچھ ہی ہو، اس کے سبب سے انھیں کیسے ہی نقصانات و آلام سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے لیکن وہ پیٹھ نہیں دکھاتے بلکہ جان کی بازی لگا کر اس کو پورا کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس معاملہ میں جو رویہ رہا ہے وہ پوری تاریخ انسانی میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ خاص کر صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے ابو جندل کے معاملہ میں معاہدہ کا جو احترام کیا وہ تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

ترجمۂ آیات ۱۷۸-۱۷۹

"اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ آزاد آزاد کے بدلے غلام غلام کے بدلے، عورت عورت کے بدلے، پس جس کسی کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی تو اس کے لیے دستور کی پیروی کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے ایک قسم کی تخفیف اور مہربانی ہے۔ تو اس کے بعد جو زیادتی کرے گا اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور تمھارے لیے قصاص میں، اے عقل والو، زندگی ہے، تاکہ تم حدودِ الٰہی کی پابندی کرو۔"

۵۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

'قصاص' کا مفہوم

قصاص، قصص سے ہے جس کے اصل معنی کسی کے پیچھے، اس کے نقشِ قدم کے ساتھ ساتھ چلنے کے ہیں۔ مثلاً وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۱۱- قصص (اور اس نے اس کی بہن سے کہا، اس کے پیچھے پیچھے جا، تو وہ دور سے اس کو دیکھتی رہی اور ان لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوا) قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۶۴ کہف (اس نے کہا یہی تو ہمیں مطلوب تھا، پس وہ دونوں اپنے نقشِ قدم کا تعاقب کرتے ہوئے پیچھے پلٹے) اسی سے قصہ کو قصہ کہتے ہیں کیونکہ جس کا قصہ بیان کیا جاتا ہے، قصہ بیان کرنے والا گویا اس کے قدم بقدم اس کے حالات کا تعاقب کرتا ہے۔ اسی سے قصاص نکلا اس لیے کہ قاتل کا بھی کھوج لگایا جاتا اور اس کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ پھر قصاص اس سزا کو کہنے لگے جس میں مجرم کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جس کا مرتکب وہ خود ہوا ہے۔ اس قصاص کی دو صورتیں ہیں۔ ایک جانی، دوسری مالی جس کو دیت یا خونبہا کہتے ہیں۔ قصاص کا لفظ اپنے وسیع معنی میں ان دونوں ہی صورتوں پر حاوی ہو جاتا ہے اس لیے کہ دیت بھی درحقیقت قصاص ہی کی ایک شکل ہے۔ اصل قانون تو جان کے بدلے جان ہی کا ہے لیکن اولیائے مقتول کی بہبود کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں اتنی رعایت فرما دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو جان کے بدلے دیت بھی لے سکتے ہیں۔

"کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى" میں کُتِبَ کے بعد علیٰ کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اس کے اندر فرضیت اور وجوب کا مضمون موجود ہے۔ قَتْلیٰ قتیل کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو گا کہ اگر کُتِبَ عَلَيْكُمْ سے قصاص کی فرضیت ثابت ہوتی ہے تو اس حکم کا مخاطب کون ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ قصاص کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے۔ اگر مقتول کے ورثا چاہیں تو قاتل کو قتل بھی کر سکتے ہیں، چاہیں تو دیت بھی لے سکتے ہیں، چاہیں تو کچھ معاف بھی کر سکتے ہیں۔ تو جب وہ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ تم پر قصاص لینا فرض کیا گیا ہے۔

قصاص کی ذمہ داری حکومت پر ہے

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس حکم کا مخاطب پورا اسلامی معاشرہ بحیثیت مجموعی یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت ہے۔ اس کے اوپر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ اس کے علاقہ میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو اس کے قاتلین کا سراغ لگائے، ان کو گرفتار کرے اور قانون کے مطابق ان پر سزا نافذ کرے۔ یہ ذمہ داری معاشرہ یا حکومت پر اس اصول کے تحت ڈالی گئی ہے کہ جو شخص کسی شخص کو بغیر کسی حق کے قتل کر دیتا ہے تو وہ صرف ایک شخص ہی کا قاتل نہیں ہے بلکہ سب کا قاتل ہے اس لیے کہ اس نے تحفظ جان کے اس قانون کو ہدم کر دیا ہے جو سب کے لیے حرمتِ جان کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ پورے معاشرے اور پورے نظامِ اجتماعی کی ذمہ داری ٹھہری کہ سب اس کے قصاص کے درپے ہوں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک حرمتِ جان کے اس قانون کو زندہ کر کے سب کی زندگی کی ضمانت کو بحال نہ کر لیں۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ مائدہ میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۳۲ (کہ جس نے کسی جان کو، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان ماری ہو یا زمین میں فساد مچایا ہو، قتل کر دیا تو گویا اس نے سارے ہی لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا سب کو زندہ کیا)

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قصاص کی اصل ذمہ داری حکومت ہی پر ہونی چاہیے نہ کہ مقتول کے وارثوں پر۔ اس لیے کہ اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص قتل ہو جائے اور اس کا کوئی والی وارث نہ ہو، اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص کے کچھ ورثا ہوں تو سہی لیکن کسی سبب سے ان کو مقتول کے قصاص کے معاملہ سے کچھ دلچسپی نہ ہو۔ بلکہ امکان تو خاصی حد تک اس بات کا بھی ہے کہ ورثا کی اصل ہمدردی اور دلچسپی کسی سبب سے مقتول کے بجائے قاتل اور اس کے شرکائے کار ہی کے ساتھ ہو جائے۔ علاوہ ازیں کسی اس طرح کے معاملہ میں تحقیق و تفتیش کی ذمہ داریاں اور پھر حدود کی تنفیذ بڑے وسیع اختیارات کی مقتضی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے جہاں تک قصاص لینے کے فرض کا تعلق ہے وہ تو اسلامی حکومت ہی پر عائد کیا ہے لیکن اس سلسلے میں اس نے

حکومت پر یہ پابندی بھی عائد کر دی ہے کہ وہ بجائے خود فیصلہ کرنے کے مقتول کے اولیاء کو یہ اختیار دے دے کہ وہ اسلامی قانون کے حدود کے اندر مجرم کے ساتھ جو معاملہ پسند کریں وہ کر لیں۔ خواہ اسے قتل کر دیں، خواہ اس سے خون بہا قبول کر لیں۔ ورثا کو یہ اختیار دے دینا اور ان کے اختیار کو نافذ کر دینا حکومت کو اس فرض سے سبکدوش کر دے گا جو اس پر کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى کی رُو سے عائد ہوتا ہے۔

قصاص میں اولیائے مقتول کی مرضی کے لحاظ کی حکمت

قصاص کے معاملہ میں مقتول کے اولیاء کی مرضی کو اسلام نے یہ اہمیت جو دی ہے، یہ مختلف پہلوؤں سے نہایت حکیمانہ ہے۔ قاتل کی جان پر مقتول کے وارثوں کو براہ راست اختیار مل جانے سے ایک تو ان کے بہت بڑے زخم کے اندمال کی ایک شکل پیدا ہوتی ہے، دوسرے اگر اس صورت میں یہ کوئی نرم رویہ اختیار کریں تو قاتل اور اس کے خاندان پر یہ ان کا براہِ راست احسان ہوتا ہے جس سے نہایت مفید نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔ تیسرے دیت کی شکل میں مقتول کے ورثا کی، بالخصوص جب کہ وہ غریب ہوں، ایسی مدد ہو جاتی ہے جس سے ان کو بڑا سہارا مل سکتا ہے۔ اگر ورثا کو اس میں کوئی دخل نہ رہ جائے، سارا اختیار پولیس اور عدالت ہی کو سونپ دیا جائے جیسا کہ موجودہ قوانین میں ہے تو وہ ان تمام فوائد سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ لیکن ان کے اس حق کے تسلیم کیے جانے کے باوجود قصاص کی اصل ذمہ دار اور اس کی نافذ کرنے والی ہے حکومت ہی۔ اس وجہ سے اگر وہ کسی خاص معاملہ میں محسوس کرے کہ وارثوں کی سرد مہری یا ان کی قاتلوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے قصاص کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے جس سے حرمتِ جان کا قانون متاثر ہو رہا ہے تو وہ اس نقصان سے قانون کو بچانے کے لیے مناسب اقدام کرے گی۔

قصاص میں مساوات کا اہتمام

"آزاد آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے، عورت، عورت کے بدلے": یہ اس کامل مساوات کا بیان ہے جو قصاص میں لازماً ملحوظ رکھنی ہے۔ یعنی اگر ایک آزاد نے دوسرے آزاد کو قتل کیا ہے تو النفس بالنفس کے قانون کے بموجب وہ آزاد ہی اس آزاد کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور بصورت خون بہا ایک آزاد ہی کی دیت اس کے بدلے میں واجب ہو گی۔ عرب جاہلیت کے طریقے کے مطابق یہ نہیں ہو گا کہ مقتول کے ورثا اپنی شرافت و برتری کے زعم میں یہ مطالبہ کریں کہ وہ اپنے ایک مقتول کے بدلے میں قاتل کے خاندان کے دو یا اس سے زیادہ آزادوں کو قتل کریں گے، یا عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کریں گے یا غلام کے بدلے میں آزاد کو قتل کریں گے یا بصورتِ دیت عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر وصول کریں گے یا غلام کی دیت آزاد کی دیت کے معیار سے لیں گے۔ اسی طرح قاتل اور اس کے خاندان و قبیلہ والوں کو بھی اپنی شرافت و نجابت اور برتری کے زعم میں یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ ہمارا غلام دوسروں کے آزاد کا کفو یا ہماری ایک عورت دوسروں کے مرد کے برابر ہے اس وجہ سے ہم قصاص جانی یا مالی میں اسی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے مقتول کے ورثا سے معاملہ کریں گے۔ اسلام نے اس کامل مساوات کا اعلان کر کے زمانہ جاہلیت کی مذکورہ تمام نابرابریوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہود نے بھی اس معاملے میں شریف و رذیل اور اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان امتیاز قائم کر رکھا تھا۔ اس

اعلان سے اس امتیاز کی بنیاد بھی ڈھے گئی۔ ایک طرف اسلام کے اس قانون کو ملاحظہ فرمایئے، جو چودہ سو سال سے اسلام کی کتاب تعزیرات میں موجود ہے، دوسری طرف عدل و مساوات کے علمبردار امریکہ میں کالوں اور گوروں کے اس امتیاز پر نظر ڈالیے جو زندگی کے ہر شعبہ میں آج اس بیسویں صدی میں بھی برتا جا رہا ہے۔

دیت کی ادائیگی میں فیاضی

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ۔ یعنی اگر مقتول کے ورثا کی طرف سے قاتل کو کچھ چھوٹ دے دی جائے تو اس کو چاہیئے وہ اس کی قدر کرے۔ اس چھوٹ کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ قصاص جانی کے بجائے قصاص مالی پر راضی ہو جائیں تو قاتل اور اس کے خاندان والوں کا فرض ہے کہ وہ احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبے کے ساتھ معروف کے بموجب دیت ادا کریں اور ادائیگی نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کریں۔ معروف سے مراد یہاں اہلِ عرب کا رواج اور دستور ہے جس کو دیت کے معاملے میں اسلام نے قانون کی حیثیت دے دی۔ حسن و خوبی کے ساتھ ادائیگی کی تاکید اس لیے فرمائی کہ عرب میں دیت کی ادائیگی بالعموم نقد کی صورت میں نہیں بلکہ جنس و مال کی شکل میں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اگر ادائیگی کرنے والوں کی نیت اچھی نہ ہوتی تو وہ اس میں بہت کچھ چالیں چل سکتے تھے۔ یہ بات بڑی آسانی سے ممکن ہے کہ اونٹوں یا بکریوں کی تعداد یا غلہ اور کھجور کی مقدار و کمیت کے لحاظ سے تو دیت کا مطالبہ پورا کر دیا جائے لیکن باعتبارِ حقیقت و کیفیت اس کی حیثیت محض خانہ پری ہی کی ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان لوگوں کے احسان کی کوئی قدر نہیں کی گئی جنھوں نے ایک شخص کی جان پر شرعی اختیار پا کر اس کو معاف کر دیا اور اس کی طرف سے مال قبول کر لینے پر راضی ہو گئے۔ ان کے احسان کا جواب تو احسان ہی ہونا چاہیئے۔ یعنی دیت کی ادائیگی اس خوبی، فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ کی جائے کہ ان کو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑے کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کے خون کے بدلے میں بھیڑ بکریاں قبول کر کے کوئی غلطی یا بے غیرتی کی۔

قصاص کے حکم کے تحت یہاں بغیر کسی سابق قرینے کے جو خونبہا کا ذکر آ گیا ہے تو اس کی بڑی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یعنی قصاص کا لفظ اپنے عام مفہوم میں قصاص جانی اور قصاص مالی دونوں ہی پر مشتمل ہے۔ اس میں کچھ چھوٹ ملنے کے معنی، جیسا کہ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ کے الفاظ سے واضح ہے یہ ہے کہ اولیائے مقتول جان کے بدلے جان لینے کے بجائے رواج کے مطابق خونبہا لینے پر راضی ہو جائیں۔ یہ خونبہا کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رعایت و رحمت ہے۔ حرمتِ جان کا اصل حق تو یہی تھا کہ جان کے بدلے جان لی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی مہربانی سے اس میں رعایت فرما دی ہے تو اس رعایت کی قدر کرنی چاہیے اور اس سے کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ یعنی جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد کسی ظلم و زیادتی کی راہ کھولیں گے تو وہ یاد رکھیں کہ پھر ان کے لیے آخرت کا عذاب دردناک ہی ہے جس سے چھڑانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہو گی۔ اس میں قاتل اور اس کے خاندان والوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد یہ انتہائی کفرانِ نعمت ہوگا کہ اس کے پردے میں مقتول کے خاندان پر کسی نئے ظلم کے لیے اسکیم بنائی جائے۔ مثلاً یہ کہ قاتل اور اس کے اعزا یہ منصوبہ بنائیں کہ اس وقت تو کسی طرح مقتول کے ورثا کو راضی کر کے اپنی جان بچالو پھر موقع پیدا کر کے اس کو مزید نقصان پہنچائیں گے۔ اسی طرح اس میں مقتول کے وارثوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ انھیں اپنے دل میں یہ منصوبہ رکھ کے دیت کا راضی نامہ نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت تو قاتل سے دیت لے لیتے ہیں، بعد میں موقع ملنے پر اس کی جان بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ خدا کی بخشی ہوئی ایک رعایت کے تحت جو راضی نامہ ہو گیا ہے، دونوں فریقوں کو سچے دل سے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ جو بھی یہ راضی نامہ ہو چکنے کے بعد کوئی زیادتی کرے گا وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھہرے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۹)

قانون جذبات سے بالاتر ہے

یہ معاشرہ کو تلقین ہے کہ قصاص کے معاملہ میں کسی سہل انگاری، کسی جانب داری، کسی چشم پوشی اور کسی بے جا رحم و مروت کو حائل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ جو کسی کو قتل کر دیتا ہے وہ صرف ایک شخص ہی کو قتل نہیں کرتا بلکہ ایک قانون کو قتل کرتا ہے جو سب کی جان کی حفاظت کا ضامن ہے اس وجہ سے وہ گویا سب ہی کو قتل کر دیتا ہے اس وجہ سے یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا قصاص لے کر اس ضمانت کو بحال کریں جس میں سب کی زندگی ہے۔ معاشرے کا جو شخص کسی قاتل کو پکڑتا ہے، یا اس کا سراغ لگاتا ہے یا اس کے جرم کے ثبوت فراہم کرتا ہے اور اس طرح مقتول سے قصاص کی راہ کھولتا ہے وہ گویا اس مقتول کو بھی زندہ کرتا ہے اور ساتھ ہی پورے معاشرے کو بھی زندگی بخشتا ہے کیونکہ وہ اپنی اس خدمت سے اس قانون کو زندہ کرتا ہے جو سب کے لیے زندگی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف سورۂ مائدہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے جس کا حوالہ اوپر بھی گزر چکا ہے۔

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ
اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ
جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا
النَّاسَ جَمِيْعًا (۳۲۔ مائدہ)

یہ کہ جس نے قتل کر دیا کسی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے
کسی جان کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو
گویا اس نے سب کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا
تو گویا اس نے سب ہی کو زندہ کیا۔

اس میں ان لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے جو بے جا قسم کی مروت و پاسداری یا ناروا قسم کے احترام شرافت و امارت کے جذبے کے تحت بسا اوقات مقتول کے بجائے قاتل ہی کی ہمدردی کو ثواب قرار دے بیٹھتے ہیں حالانکہ اصلی ہمدردی ہر ایک کے ساتھ، غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، قریب ہو یا بعید، جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۱۳۵ میں ہے، یہی ہے کہ اس کو خدا اور اس کے قانون کے حوالہ کیا جائے نہ کہ خدا کے قانون سے چھڑا کر شیطان کے حوالہ۔ لیکن اس حقیقت کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اہل عقل

ہیں۔ اس وجہ سے آیت میں اہلِ عقل کو خاص طور پر خطاب فرمایا ہے۔

کیا تعزیرات خلافِ عقل ہیں؟

اہلِ عقل کو خاص طور پر توجہ دلانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح جذبات بعض اوقات قانونِ قصاص کے نفاذ میں مزاحم ہوتے ہیں اسی طرح جذبات سے مرعوب و مغلوب عقل بھی اس قانون کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں تو تمام جسمانی سزاؤں کے خلاف ایک مستقل فلسفہ بن گیا ہے جس کو پیش تو کیا جاتا ہے عقلیت اور فلسفہ کے روپ میں لیکن تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر بھی اصلی روح عقل کی نہیں بلکہ جذبات ہی کی ہے۔

ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ مجرموں سے جو جرم سرزد ہوتے ہیں وہ اصلاً جذباتی بے اعتدالی، عقلی عدمِ توازن اور ذہنی انتشار اور الجھاؤ کے نتیجہ میں صادر ہوتے ہیں اور یہ حالتیں آدمی کی بیماری کی حالتیں ہیں جن میں وہ مستحق اصلاح و تربیت اور علاج و دوا کا ہوتا ہے نہ کہ سزا کا۔ اس وجہ سے اس گروہ کے نزدیک کسی قاتل کو قتل کی سزا دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کو بیمار ہونے پر اس کے علاج کے بجائے کوئی سزا دے دینا۔ اس گروہ کے نزدیک اس طرح کے مجرموں یا خود ان کے الفاظ میں اس طرح کے مریضوں کا علاج تعلیم و تربیت اور اصلاحِ نفسی و ذہنی کے ذریعہ سے ہونا چاہیئے نہ کہ سولی اور پھانسی سے۔

یہ نظریہ موجود تو دنیا میں ایک خاص گروہ میں شروع سے رہا ہے لیکن اس کو علمی اعتبار سے کبھی اہمیت حاصل نہیں ہو سکی اور نہ شاید کبھی حاصل ہو سکے۔ تاہم اس دورِ آخر میں چونکہ ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی جیسے لوگوں نے اس کی وکالت کی ہے اس وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن اس سے متاثر ہیں۔ ایسے لوگوں کی الجھن دور کرنے کے لیے قانونِ قصاص کی اس حکمت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے خاص طور پر اہلِ عقل کو مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اس کے اندر زندگی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ زندگی فرد کے لحاظ سے نہیں بلکہ معاشرے کے لحاظ سے ہے۔ اگر ایک شخص قتل کے جرم میں قتل کر دیا جاتا ہے تو بظاہر تو ایک جان کے بعد یہ دوسری جان بھی گویا تلف ہی ہوتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اگر دیکھیے تو اس کے قتل سے پورے معاشرے کے لیے زندگی کی ضمانت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس سے قصاص نہ لیا جائے، تو یہ جس ذہنی خرابی میں مبتلا ہو کر ایک بے گناہ کے قتل کا مرتکب ہوا ہے وہ خرابی پورے معاشرے میں متعدی ہو جائے۔ بیماری اور بیماری میں فرق ہوتا ہے۔ جو بیماریاں قتل، ڈکیتی، چوری اور زنا وغیرہ جیسے خطرناک جرائم کا سبب بنتی ہیں ان کی مثال ان بیماریوں کی ہے جن میں پورے جسم کو بچانے کے لیے بسا اوقات جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کسی عضو کو کاٹ پھینکنا ایک سنگدلی کا کام معلوم ہوتا ہے لیکن ایک ڈاکٹر کو یہ سنگدلی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ طبیعت پر جبر کر کے یہ سنگدلی اختیار نہ کرے تو اس ایک عضو کی ہمدردی میں اسے مریض کے پورے جسم کو ہلاکت کے حوالہ کرنا پڑے گا۔

معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس جسم کے بعض اعضا میں بھی بسا اوقات

اسی قسم کا فساد و اختلال پیدا ہو جاتا ہے جس کا علاج مرہم و ضماد سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ عضو مریض پر آپریشن کر کے اس کو جسم کے مجموعے سے الگ کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ عضو مریض ہے اس وجہ سے نرمی اور ہمدردی کا مستحق ہے تو اس نرمی کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ایک دن یہ عضو سارے جسم کو سڑا اور گلا کر رکھ دے۔

یہی نکتہ ہے کہ قرآن مجید نے اس قسم کی سزاؤں کو، جو سخت نوعیت کی ہیں، 'نکال'، کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ 'نکال' عربی میں اس سزا کو کہتے ہیں جو دوسروں کو عبرت دلانے والی ہو، جس کو دیکھ کر دوسرے نصیحت پکڑیں اور اس قسم کے جرم کے ارتکاب سے باز رہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کی سزائیں نافذ کر کے گویا پورے معاشرہ کو ایسے ٹیکے لگا دیئے جاتے ہیں جس سے وہ متعدی جرائم کے اثرات سے محفوظ ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں بھی قرآن نے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے جس کے معنی ہیں تاکہ تم بچو یعنی اللہ کے حدود کی خلاف ورزی اور ایک دوسرے پر ظلم و تعدی سے بچو۔

۵۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۸۰-۱۸۲

حرمتِ جان کے اس قانون کے بعد حرمتِ مال کے قانون کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ دونوں مضمون قرآن[۱] و حدیث دونوں میں بالعموم ساتھ ساتھ آتے ہیں اور عقل و فطرت میں بھی ان دونوں کے درمیان بڑا قریبی رشتہ ہے۔ حرمتِ مال کے سلسلے میں بنیادی چیز یہ ہے کہ ایک قانون کے تحت ہر شخص کے اور اس کے بعد اس کے وارثوں کے حقوق متعین و محفوظ ہوں اور دوسرے ان حقوق کا احترام کریں۔ اہلِ عرب میں اگرچہ معروف کے تحت والدین اور اعزا و اقربا کے حقوق کا فی الجملہ تعین تھا لیکن ان کی زندگی کے ہر پہلو میں جس طرح خرابیاں پیدا ہو گئیں اسی طرح اس پہلو میں بھی فساد رونما ہوا اور ان کے زور آور لوگوں میں کمزور وارثوں اور حق داروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان اس شدت کے ساتھ زور پکڑ گیا کہ معروف کی ان کے ہاں کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ سورۂ فجر میں اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (اور تم وراثت کو سمیٹ کر کھاتے ہو) یہ صورت تقاضا کر رہی تھی کہ قانون کے ذریعہ سے اعزا و اقربا کے حقوق کا تعین کر کے ان کی حفاظت کا سامان کیا جائے لیکن اس سورہ کے زمانۂ نزول تک معاشرہ ابھی اتنا مستحکم نہیں ہوا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ مستقل قانون نافذ ہو سکے جو سورۂ نساء میں ہے، اس وجہ سے عبوری دور کے لیے مورثوں کو دستور کے مطابق والدین اور قرابت مندوں کے لیے وصیت

---

[۱] ملاحظہ ہو آیت ۲۹، نساء۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ حرمۃ مالہ کحرمۃ دمہ (اس کے مال کی عزت اس کی جان کی عزت کی طرح ہے)